۲

قرآن فہمی

استاد مرتضیٰ مطہری شہید

محفوظ بک ایجنسی • تاجران کتب کراچی
Tel: 4124286-4917823 Fax: 4312882

قرآن فہمی

(۲)

استاد مرتضیٰ مطہری شہید

ترجمہ

سید گلشن عباس نقوی

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰، گنگا رام بلڈنگ، شاہراہ قائد اعظم لاہور

نام کتاب ——— قرآن فہمی (جلد ۲)
مؤلف ——— استاد مرتضیٰ مطہری شہیدؒ
مترجم ——— مولانا گلشن عباس نقوی
ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ
کتابت ——— محمد اقبال
مطبع ——— معراج دین پرنٹرز
اشاعت ——— مارچ ۱۹۹۷ء
ہدیہ ——— ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ
قرآن سنٹر۔ اردو بازار لاہور

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

عرضِ ناشر

قرآن ـــــ فرقان حمید، کتاب خدا اور منبع ہدایت ہے، یہ بے مثل و بے نظیر کتاب ہے کہ اس کی آیات دلنواز، مطالب بلند، مفاہیم دور رس اور لہجہ دلنشیں ہے۔

قرآن ـــــ کتاب لاجواب، درس انقلاب اور رہنمائے شیخ و شاب ہے، فوز و فلاح کی نوید، عذاب و عقاب کی وعید، خیر و نیکی کا نقیب اور شر و بدی کا مخالف ہے۔

قرآن ـــــ خالق کا ترجمان، مخلوق کی داستان، انسانیت کا دبستان اور سرچشمۂ دین و ایمان ہے، یہ خدائے رحمان کا کامل ترین کلام، آخری الہامی کتاب اور نوع بشر کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

نوع بشر کے لیے اس مکمل ضابطۂ حیات ـــــ قرآن ـــــ کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ کسی بھی ضابطۂ قانون کو سمجھے بغیر اس پر عمل کرنا کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کے علمائے اسلام قرآن کی تعلیم و تفہیم کے ضمن میں بہترین کوششیں بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ایک ذی علم اور با بصیرت عالم دین استاد مرتضیٰ مطہری شہیدؒ بھی خادمان قرآن کے اسی باعظمت زمرے میں شامل ہیں۔

استاد مطہری شہیدؒ نے ایران میں ایک ایسے وقت قرآن اور قرآنی افکار کو مسلم نوجوانوں کے قلب و ذہن میں بسانا شروع کیا جبکہ وہاں لہو و لعب کا دور دورہ تھا اور مغربی تہذیب و تمدن کے منحوس سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ آپ نے انسان در قرآن اور اسلام در قرآن کے عنوان سے کتابچے مرتب کیے لیکن ان سے پہلے شناخت

قرآن کے نام سے ایک مفید کتابچہ لکھا اور اس کے ذریعے قرآن سے نوجوانوں کا پُر جوش تعارف کرانے کا آغاز کیا۔

موصوف کے مذکورہ کتابچے شناخت قرآن ؑ کے ایک حصّے کا اُردو ترجمہ ہم بہت پہلے قرآن فہمی حصّہ اوّل کے نام سے شائع کر چکے ہیں حصّہ دوم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

استاد مطہری شہید کا نام اور کام پاکستان سمیت دنیا کے کسی بھی خطّے میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ جس بھی موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے تھے۔ اُردو ترجمہ مولانا گلشن عباس نقوی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جسے ہم ان کی اس علمی خدمت کے اعتراف کے ساتھ شائع کر رہے ہیں

ہمیں اُمید ہے کہ اُردو خواں مومنین اور خاص کر ہمارے نوجوان اس علمی و تربیتی کتابچے سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ ہم نے اس کی ترتیب و طباعت میں پوری توجہ اور دلچسپی سے کام لیتے ہوئے اسے خوب صورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاہم اس سلسلے میں آپ کی قیمتی آراء کے منتظر رہیں گے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

maablib.org

قرآن فہمی

قرآن فہمی	7
ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے	8
اللہ کے معنی	12
الرحمٰن الرحیم	12
الحمد للہ	15
ربّ العالمین	21
مالک یوم الدین	26
ایاک نعبد وایاک نستعین	29
توحید نظری اور توحید عملی	30
لفظ عبادت کا مادہ	34
شرک و توحید	35
ایاک نستعین	41
اہدنا الصراط المستقیم	44
صراط الذین انعمت	48
دوسرا گروہ	49
تیسرا گروہ	49
سورہ بقرہ	51
سورہ کی وجہ تسمیہ	52
حروف مقطعات	52
اقامت نماز سے کیا مراد ہے؟	63
ومما رزقناھم	63
کیا انفاق مال کے ساتھ مختص ہے؟	64
فلسفہ انفاق	64
کفر مقدس	74
منافقت کی تعریف	78
خصلت اوّل	88
خصلت دوم	88
خصلت سوم	88
خصلت چہارم	88
خصلت پنجم	89
خصلت ششم	89
قرآن کریم کا نظریہ	103

maablib.org

اصالت حق کیا ہے 105

قرآن کے مخاطبین 119

توحید کا پیغام 123

شرک اور توحید 124

قرآن کے معجزہ ہونے سے انکار خود قرآن سے انکار ہے 128

لفظ معجزہ کے لغوی معنی 128

قرآن مجید نے معجزہ کو آیت کیوں کہا ہے؟ 129

معجزہ کیا ہے 130

وضاحت 131

مزید تشریح 132

کیا معجزہ ممکن ہے؟ 133

کیا معجزہ واقع ہوتا ہے؟ 138

معجزہ کس طرح اپنے لانے والے کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے 139

دلالت قراردادی 139

دلالت طبعی 140

دلالت عقلی 140

پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات 143

اعجاز قرآن 157

اعجاز قرآن کی وجوہ 160

حواشی 172

madlib.org

قرآن فہمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

جب سے قرآن کریم لکھا جانے لگا ہے سورۂ برات کے سوا ہر سورہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے یعنی ہر سورہ کا آغاز "بسم اللہ" سے ہوتا ہے۔ لیکن عرصہ دراز سے اہل تشیع اور اہل تسنن کے درمیان اس بارے میں شدید اختلاف چلا آرہا ہے کہ یہ آیت ہر سورہ کا حصہ ہے یا نہیں۔ اہل تسنن اس کو کسی بھی سورہ کا حصہ شمار نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک کسی سورہ کا بسم اللہ سے آغاز کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہر کام کو بسم اللہ سے شروع کرنا جس کا جزو بسم اللہ نہ ہو' بلکہ وہ بعض اوقات عملی طور پر بھی بسم اللہ کے بغیر ہی سورہ ہائے قرآن کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ حضرات نماز میں سورۂ حمد یا سورۂ حمد کے بعد جس سورہ کو بھی پڑھتے ہیں بسم اللہ کے بغیر ہی پڑھتے ہیں۔

اہل تشیع ائمہ طاہرین علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے اس نظریہ کے شدید مخالف ہیں۔ ائمہ طاہرینؑ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہلاک کرے جنھوں نے قرآن کریم کی اس عظیم ترین آیت کے قرآن مجید کا جزو ہونے سے انکار کیا ہے۔ اگر بسم اللہ کو قرآنی سورتوں کے شروع سے ہٹا دیا جائے تو پھر سورہ نمل کے علاوہ قرآن کریم میں کہیں بھی یہ آیت باقی نہیں رہتی۔ سورۂ نمل میں بھی قرآن مجید اس آیت کو ملکہ سبا کی طرف گفتگو کو نقل کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ جب ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ کا خط پڑھا تو کہا۔ **"انه من سلیمان و انه بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم"** (نمل/۳۰) یعنی یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...."

بہر حال شیعہ اس کو مسلمہ طور پر قرآن مجید کا جزو قرار دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اسے قرآن سے الگ شمار کرتے ہوں۔ وہ تلاوت قرآن پاک کا آغاز "بسم اللہ" کے ساتھ اس طور پر کرتے ہوں جیسا کہ ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے کرتے ہیں۔ ا۔

ہر کام کا آغاز اللہ کے نام سے

یاد رکھیں کہ زیر بحث آیت مجموعی طور پر جار و مجرور کی حامل ہے یہ کوئی مکمل جملہ نہیں ہے۔ اس جار و مجرور کا متعلق محذوف ہے۔ مفسرین نے اس حوالہ سے کہ اس کا محذوف متعلق کیا ہے' مختلف نظریات بیان کئے ہیں جن میں بعض یہ ہیں۔ **استعین**' (میں مدد چاہتا ہوں)' **ابتدء** (میں ابتدا کرتا ہوں) **اسم** (میں نشانی و علامت لگاتا ہوں)۔ ان میں آخری نظریہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نام رکھنے کے مقاصد و اہداف مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی شخص کسی مادی مقصد کے حصول کے پیش نظر اپنے ادارہ کا نام کسی فرد کے نام پر رکھتا ہے تاکہ وہ اس نام کی بدولت مطلوبہ مقصد پا سکے۔

رواج یہ بھی ہے کہ نومولود کا نام اپنی کسی پسندیدہ شخصیت کے نام پر رکھا جاتا ہے جس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ اس نام کے ذریعہ مطلوبہ شخص حیات نو کو حاصل کرے اور اس نام کی بقا کے ساتھ باقی رہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کاموں کو اللہ تعالیٰ کے نام سے موسوم کرے تو اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ انسان کے کاموں میں تقدس و عبادت کا پہلو پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نام سے کام میں برکت پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق انسان کا احساس فطری ہے۔ وہ اسے قدوس (ہر عیب و نقص سے پاک) اور بھلائیوں کا سرچشمہ جانتا ہے۔ لہذا جب وہ اپنے کام کو اللہ کے نام سے موسوم کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے قدس' بزرگی اور کرم کے زیر سایہ یہ کام بھی مقدس ہو جاتا ہے۔

چونکہ انسان حق تعالیٰ کو قدوس، تمام نقائص سے مبرا ذات اور تمام کمالات کا سرچشمہ سمجھتے ہوئے اپنے کام میں برکت پیدا کرنے کے لیے اسے حق تعالیٰ کے نام سے موسوم کرتا ہے لہٰذا اس کے نام سے آغاز کرتا ہے۔ اسی لیے کسی دوسرے فرد حتیٰ کہ پیغمبرؐ کے نام سے بھی کام کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے نام کی تسبیح کرنے، جس کا حکم سورۂ اعلیٰ کی ابتدا میں دیا گیا ہے، کے یہی معنی ہیں۔

"یسبح للّٰہ" "سبح للّٰہ" اور **سبحان اللّٰہ** کے الفاظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ لیکن اللہ کے نام کی تسبیح کا ذکر قرآن میں فقط سورۂ اعلیٰ میں آیا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے۔

"سبح اسم ربک الاعلیٰ" (اعلیٰ /۱) (بزرگ ترین رب کے نام کی تسبیح کرو)

اس مقام پر تفسیر المیزان کے مصنف کا نظریہ بہترین معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نام کی تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ تقدیس و تکریم کے مقام پر مخلوق کا نام اللہ کے نام کے ساتھ نہ لیا جائے، یا یہ کہ جہاں اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے وہاں کسی دوسری فرد کا نام نہ لیا جائے یعنی نہ تو اللہ کے نام کے ساتھ کسی کا نام لیا جائے اور نہ ہی اللہ کے نام کی جگہ کسی کا نام لیا جائے کیونکہ یہ دونوں باتیں شرک میں شامل ہیں۔

ان دنوں شرک کے خلاف جہاد کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ایک گروہ میں ایک عمل رائج ہو گیا ہے جو بجائے خود شرک کا مظہر ہے۔ یہ لوگ اپنے کاموں کو اللہ کے نام سے موسوم کرنے اور اس کے نام سے آغاز کرنے کی بجائے مخلوق کے نام سے شروع کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے نام کے ساتھ پیغمبرؐ کا نام لینا شرک قرار دیا جائے تو پھر اگر کسی اور مخلوق کے نام سے آغاز کیا جائے تو یہ اللہ کا جانشین قرار دینا ہو گا۔ جبکہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کے نام ہی کی تسبیح کی جائے اور انسان کے کاموں کو اسی کے نام سے موسوم کیا جائے کسی دوسرے کے نام سے نہیں اس طرح اس کے اعمال میں تقدس پیدا ہو گا اور اللہ کے زیر سایہ ان میں برکت آئے گی۔

اللّٰہ

اللہ خدا تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام ہے۔ افراد یا اشیا کے جو نام رکھے جاتے ہیں وہ یا تو کسی علامت کی خاطر ہوتے ہیں یا کسی صفت کے باعث ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے نام اگرچہ معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ تاہم ان کے معانی پیش نظر نہیں ہوتے بلکہ ایسے نام فقط پہچان کی غرض سے رکھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حیثیت علامت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایسا نام اس کے حامل کے اوصاف کی نشاندہی نہیں کرتا جس کا یہ نام ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس ہونے کا پتہ دیتا ہے' مثلاً حبشی غلاموں کا نام کافور رکھا جاتا تھا۔

"برعکس نہند نام زنگی کافور"

دوسری قسم کا نام' نام والے شخص کی حیثیت کے مطابق اس کی کسی صفت کا پتہ دیتا ہے۔

پروردگار عالم کا کوئی بھی نام ایسا نہیں جو صرف اس کی علامت کا پہلو اپنے اندر لئے ہوئے ہو۔ اس کے تمام اسما اس کی مقدس ذات کی کسی نہ کسی صفت کو ظاہر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے تقریباً ایک سو نام بیان ہوئے ہیں' جو حقیقت میں اس کی ایک سو صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے نمونہ جات آپ متعلقہ سورہ میں ملاحظہ فرمائیں گے یعنی اللہ' رحمٰن' رحیم' مالک یوم الدین لیکن کسی دوسرے نام میں وہ ہمہ گیری نہیں ہے جو "اللہ" میں پائی جاتی ہے کیونکہ دوسرا ہر نام اللہ تعالیٰ کے کسی ایک کمال کی نشاندہی کرتا ہے لیکن یہ نام ایسی ذات پر دال ہے جس میں تمام صفات کمالیہ پائی جاتی ہیں۔

لفظ اللہ اصل میں **الالٰہ** تھا جس میں ہمزہ کثرت استعمال سے حذف ہو گئی ہے۔

لفظ اللہ کی اصل کے متعلق لغت میں چند نظریات پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ **الٰہ** سے مشتق ہوا ہے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ **ولہ** سے نکلا ہے۔ **الٰہ** فعال کے وزن پر اسم مفعول کے معنی رکھتا ہے' یہ کتاب کی مانند ہے جو کہ مکتوب کے معنی میں ہے۔

اگر یہ **الہ** سے مشتق ہوا ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ ایسی ذات ہے جو عبد کے لیے مقام عبادت میں ہر اعتبار سے کامل ہے کیونکہ جو چیز کسی دوسری چیز کی پیدا کردہ ہو یا اس میں نقص پایا جاتا ہو لائق عبادت نہیں ہو سکتی۔ پس **الالہ** کے معنی یہی ہیں کہ وہ ایسی ذات ہے جس کی عبادت کرنا لازم ہے۔ اور لامحالہ یہی معنی اس میں پائے جاتے ہیں کہ وہ ایسی ذات ہے جس میں تمام صفات کمالیہ پائی جاتی ہیں اور وہ ہر طرح کے عیب و نقص سے پاک ہے۔

اگر یہ لفظ **ولہ** سے مشتق سمجھا جائے' **ولہ** یعنی حیرت' **والہ** یعنی حیران' یا عاشق و فریفتہ کے معنی میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو اس لیے اللہ کہا گیا ہے کہ عقول اس کی ذات مقدس کے سامنے حیرت زدہ یا اس میں محو یا اس کی عاشق' یا اس کی پناہ کی طالب ہیں۔

سیبویہ عربی ادب اور صرف و نحو کے ائمہ میں سے ایک ہے۔ اس کا تعلق دوسری صدی کے اواخر اور تیسری صدی کے اوائل سے ہے۔ وہ اپنے فن میں نابغہ تھا۔ اس کی کتاب کو' جو الکتاب کے نام سے مشہور ہے' اس فن میں وہی مقام حاصل ہے جو ارسطو کی منطق کی کتاب کو منطق میں' بطلیموس کی مجسطی کو علم ہیئت میں حاصل ہے۔ اس کا کلام عربی ادب میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس نظریہ کا حامی ہے کہ لفظ اللہ **ولہ** سے مشتق ہے جس کے معنی اس حیرت کے ہیں جو عظمت کے سامنے پیدا ہوتی ہے یا **ولہ** عشق کے معنی میں ہے۔

مولانا روم اس کے نظریہ کو اپنی مثنوی میں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

معنی آن اللہ گفت سیبویہ

یولہون فی الحوائج ہم لدیہ

گفت الہنا فی حوائجنا الیک

و التمسنا ہا وجدنا ہا لدیک

مولانا روم اس کیفیت کی یاد دہانی کراتے ہیں جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کسی مشکل میں پھنس جائے' بے سہارا ہو جائے تو اس وقت وہ بے اختیار جس ذات کی طرف رجوع کرکے پناہ کا طلبگار ہوتا ہے۔ وہ "اللہ" ہے۔

صد ہزاران عاقل اندر وقت درد
جملہ نالاں پیش آن دیان فرد
بلکہ جملہ ماھیان در موجھا
جملہ پرندگان در اوجھا
بلکہ جملہ موجھا بازی کنان
ذوق و شوقش را عیاں اندر عیاں ہے۔

یعنی صرف انسان ہی نہیں جو بوقت حاجت اس کی بارگاہ کا رخ کرتا ہے بلکہ سمندر کی مچھلیاں امواج میں' پرندے آسمان کی بلندیوں میں' بلکہ سمندر کی بے جان امواج بھی اللہ کی بارگاہ میں اپنی فریاد پیش کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس بات کا قوی احتمال ہے کہ الہ اور ولہ ایک ہی لفظ کے دو مختلف لہجے ہوں' یعنی پہلے ولہ ہو اور بعد میں اس کو الہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہو۔ جب اس کا تلفظ الہ کیا جاتا تھا تو اس میں عبادت کے معنی پیدا ہو گئے۔ اس بنا پر لفظ اللہ کے معنی یہ ہوں گے۔ "وہ ذات تمام مخلوق فطرتاً" جس کی عبادت گذار ہے اور فقط وہی ایسی ذات ہے جو لائق عبادت ہے۔"

اللہ کے معنی

کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان میں لفظ اللہ کا مترادف کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جسے اس کے بجائے استعمال کیا جا سکتا ہو۔ کوئی لفظ بھی اللہ کے کامل معنی ادا نہیں کرتا۔ اگر اللہ کی جگہ "خدا" کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہ درست نہیں ہو گا۔ کیونکہ خدا' "خود آی" کا مخفف ہے اور فلاسفہ کی بیان کردہ تعبیر "واجب الوجود" کی ترجمانی کرتا ہے' یا شاید غنی کا لفظ جو قرآن کریم میں آیا ہے "اللہ" سے قریب تر سمجھا جائے۔ اگر خداوند کا لفظ استعمال کیا جائے تب بھی صحیح نہیں ہو گا۔ کیونکہ خداوند کے معنی مالک کے ہیں۔ اگرچہ اللہ خداوند بھی ہے لیکن خداوند کا مترادف نہیں ہے کیونکہ خداوند ہونا اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔

الرحمٰن الرحیم

فارسی زبان میں کوئی سے دو لفظ بھی ایسے نہیں ملتے جو ان دو الفاظ کا ہو بہو ترجمہ ہوں۔ ان کا ترجمہ عموماً "بخشندہ مہربان" کیا جاتا ہے مگر یہ مکمل ترجمہ نہیں ہے کیونکہ بخشندہ (عطا کرنے والا) جواد کو کہتے ہیں۔ اسی طرح "رؤف" کے معنی مہربان ہیں اور یہ دونوں لفظ پروردگار کی صفات ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا ہے۔ جواد (عطا کرنے والا)' یعنی وہ جس کے پاس کوئی چیز ہو اور وہ معاوضہ طلب کئے بغیر اسے دوسرے کو عطا کر دے۔ اسی طرح رحمٰن و رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور رحمت میں مزید ایک معنی پوشیدہ ہیں وہ یہ کہ جب کوئی حاجت مند و مستحق شخص اپنی زبان یا تکوین کی زبان سے حاجت طلب کرے' ہاتھ پھیلائے' یعنی اس کی حالت قابل رحم ہو اور وہ کسی چیز کا مستحق ہو تو یہ رحمت کا موقعہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ایک انسان کی رحمت دوسرے انسان تک اس وقت پہنچتی ہے جب وہ موخرالذکر کی حالت سے متاثر ہو اور اس میں رقت قلبی پیدا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان امور سے منزہ ہے۔

پس جب ہم رحمٰن و رحیم کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو معنی آتے ہیں۔ اول مخلوق کی مکمل حاجت مندی' گویا پوری مخلوق اپنی استعداد کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی بے نیاز بارگاہ میں دست سوال پھیلائے ہوئے التماس کر رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی بے حساب رحمت مخلوق پر نازل کرکے ان کی حاجت روائی فرما رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معاصر مترجمین نے جب یہ محسوس کیا کہ کوئی لفظ بھی ان الفاظ کے معانی کو پورے طور پر بیان نہیں کر سکتا تو انہیں آیہ مبارکہ **"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"** کا ترجمہ "بہ نام اللہ رحمٰن رحیم" ۳۔ کرنا پڑا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمٰن اور رحیم میں فرق کیا ہے؟ پہلے ہمیں وضاحت کرنا ہوگی کہ عربی زبان میں جو الفاظ فعلان کے وزن پر ہوتے ہیں وہ کثرت پر دلالت کرتے ہیں' مثلاً عطشان کے معنی ہیں بہت زیادہ پیاسا۔ اسی طرح جو الفاظ فعیل کے وزن پر ہوتے ہیں ان کو اصطلاح میں صفت مشبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ الفاظ ایک طرح کے دوام و ہمیشگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

لہذا رحمٰن جو فعلان کے وزن پر ہے' کثرت و وسعت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کی رحمت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے اور ہر چیز پر محیط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کا وجود رحمت حق تعالیٰ کا اظہار ہے کیونکہ وجود و ہستی بذات خود رحمت ہیں۔ جیسا کہ سورہ اعراف آیت ۵۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔ **و رحمتی وسعت کلی شی** (اور میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے)۔ اسی طرح دعائے کمیل میں ہم پڑھتے ہیں **"و برحمتک التی وسعت کل شئی"** یعنی "تیری اس رحمت کا واسطہ جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے"

حق تعالیٰ کی اس قسم کی رحمت سے کوئی چیز مستثنیٰ نہیں' ایسا نہیں ہے کہ یہ رحمت صرف انسانوں کے شامل حال ہو' دوسروں کے شامل حال نہ ہو' یا انسانوں میں سے فقط مومنین کے شامل حال ہو' بلکہ حق تعالیٰ کی رحمانیت یا تو پوری کائنات کے شامل حال ہے' یا کائنات بعینہٖ رحمت ہے' یعنی کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ حق تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ لہذا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے جملہ سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خیر و شر دونوں کا نزول نہیں ہوتا' بلکہ اس کی طرف سے صرف بھلائی و رحمت ہی عطا ہوتی ہیں اور رحمت تمام جمادات' نباتات' حیوانات اور انسانوں کے شامل حال ہوتی ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ہستی کا وجود و نشوونما صرف حق تعالیٰ کی رحمت کے نتیجہ میں ہی ہوتا ہے۔

رحیم فعیل کے وزن پر ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی منقطع نہ ہونے والی دائمی رحمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ لفظ رحمٰن اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت پر دلالت کرتا ہے اور تمام مخلوق پر محیط ہے۔ تاہم آخر کار موجودات کا ایک سلسلہ ایسا ہے جو خلقت ختم ہو کر اس کی طرف راجع ہوتا ہے' لیکن رحیم رحمت کی وہ قسم ہے جو ابدی ہے اور صرف ان بندوں پر وارد ہوتی ہے جو اپنے معیار ایمان و نیک اعمال کے ذریعہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی اس خاص رحمت کا اہل بنا چکے ہوتے ہیں۔

الغرض پروردگار عالم کی ایک رحمت عام ہے اور ایک رحمت خاص۔ اس نے اپنی رحمت عام سے تمام موجودات کو خلق فرمایا ہے جن میں انسان بھی شامل

ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں انسان ایسی واحد مخلوق ہے جو مکلف ہے اور اپنے مقام پر خود ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والی تمام ذمہ داریوں اور تکالیف شرعی سے عہدہ برآ ہو تو وہ اللہ کی خاص رحمت سے سرفراز ہو گا۔ رحمان اس بے حساب رحمت کی جانب اشارہ ہے جو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ بلا امتیاز مومن' کافر' حتیٰ کہ انسان' جمادات' نباتات اور حیوانات سب کے لیے ہے جبکہ لفظ رحیم اس خاص رحمت کا پتہ دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے صرف مطیع و فرمان بردار بندوں کے ساتھ مختص ہے۔ ۳۔

الحمدللہ

یہاں بھی ہم یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ فارسی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو لفظ حمد کی پورے طور پر ترجمانی کر سکے۔ صرف دو لفظ ایسے ہیں جو حمد کے معنی کے قریب تر ہیں اور اس کے مترادف فارسی میں موجود ہیں۔ لہٰذا عموماً حمد کے معنی ادا کرنے کے لیے ان مترادف الفاظ سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ ایک تو لفظ مدح ہے جو ستائش کا مترادف ہے دوسرا شکر ہے جس کا ترجمہ سپاس کیا جاتا ہے۔ تاہم ان دونوں لفظوں میں کوئی بھی مکمل طور پر حمد کے معنی کو ادا نہیں کرتا۔

مدح کا لفظ حمد سے قریب تر ہے بعض حضرات نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ ایک ہی لفظ کے دو تلفظ ہیں اور عربی زبان میں ایسے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ملس و لمس' ایس و یاس وغیرہ۔ یہ ایک جیسے حروف ہی سے بنتے ہیں جو صرف آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔

مدح کے معنی ستائش کے ہیں۔ ستائش انسان کے خاص احساسات میں سے ہے۔ یعنی یہ احساس و ادراک فقط انسان میں ہی پایا جاتا ہے۔ جب انسان کمال و جلال اور زیبائی و جمال سے دوچار ہوتا ہے تو ردعمل کے طور پر ان خوبیوں کی ستائش کا احساس اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حیوان اس احساس سے تہی دامن ہے۔ حیوان نہ تو اس کمال و جلال و عظمت کا ادراک کر سکتا ہے اور نہ ہی ان

صفات کی ستائش کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اس کے باوجود بعض اوقات ستائش کا عمل انسان میں گھٹیا صورت میں رونما ہوتا ہے جسے چاپلوسی کہتے ہیں اور یہ عمل بری صفات میں شمار ہوتا ہے۔ چاپلوسی انسان کے کسی چیز کے بے جا تعریف کرنے کو کہتے ہیں یہ انتہائی ذلیل بات ہے کہ انسان اس قوت کو جو اللہ تعالیٰ نے اسے حقیقی زیبائی' عظمت' جمال اور کمال کی تعریف کرنے کے لیے عطا فرمائی ہے' لالچ کی خاطر ایسی چیز کی تعریف میں صرف کرے جو کسی بھی طرح لائق تعریف نہ ہو۔ یہ کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس لیے انسان کو عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے اس عظیم جذبہ یعنی کسی کمال کی تعریف و تمجید کرنے کو عملی جامہ پہنا سکے۔ یہ اس لیے عطا نہیں کی گئی کہ انسان اس کو لالچ کی خاطر' جو ایک پست کیفیت ہے' ایسی چیز کے لیے استعمال کرے جو کسی طرح تعریف کے قابل نہ ہو۔ یہ قوت انسان کو اس لیے عطا ہوئی ہے کہ وہ اس احساس بلند مرتبہ کو صحیح مواقع پر استعمال میں لائے یعنی ہمیشہ کسی کمال کے موقع کی تعریف و تکریم و تعظیم کا اظہار کرے' اس پر اپنی رضامندی و خوشی ظاہر کرے' نہ کہ اس کو طمع و لالچ کے لیے قرار دے جو پست احساسات کہلاتے ہیں۔ حقیقی مقامات ستائش میں ہرگز کسی قسم کا لالچ و طمع نہیں ہوتا بلکہ یہ فطری و طبعی جذبات ہوتے ہیں کہ جب انسان خوبی و زیبائی کا مشاہدہ کرتا ہے تو خود بخود اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ مثلاً انسان جب اس قرآن کو دیکھتا ہے جو کئی سال پہلے "بایسنقر" نے لکھا تھا' تو اس کی زیبائی میں کھو جاتا ہے اور بے اختیار اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اگر اس موقع پر کوئی پوچھے کہ تم اس کی تعریف کیوں کر رہے ہو' کیا کوئی شخص تمہیں اس کا معاوضہ دے گا' تو ہم کیا جواب دیں گے سوائے اس کے کہ کیا ضروری ہے کہ تعریف معاوضہ کے لیے کی جائے؟ میں انسان ہوں اور انسان جب کسی چیز کی عظمت' جلال' جمال اور کمال کا مشاہدہ کرتا ہے تو مجبور ہو جاتا ہے کہ بحیثیت انسان خاضع ہو اور اپنے خضوع کا تعریف کی صورت میں اظہار کرے۔ لفظ مدح کے معنی یہی ہیں لیکن حمد کا مفہوم ان معنی سے ادا نہیں ہوتا۔

ایک اور پاکیزہ احساس انسان میں پایا جاتا ہے' یہ بھی انسان کے امتیازات

میں سے ہے۔ اس کو "سپاس گزاری" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شکر کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا موقع اس وقت آتا ہے جب کوئی شخص کسی کے ساتھ بھلائی کرے تو دوسرے انسان کی انسانیت متقضی ہوتی ہے کہ وہ بھلائی کرنے والے کا شکریہ ادا کرے۔ فرض کریں کہ گاڑی پر سوار ایک شخص کسی جگہ سے گزرنا چاہتا ہے اور سامنے سے دوسری گاڑی آجاتی ہے جو پہلے گزرنے کا حق رکھتی ہے' بلکہ پہلے گزر سکتی ہے۔ ایسے موقع پر دوسرا شخص خود ٹھہر جائے اور اسے پہلے گزرنے دے تو انسانی شرافت جو انسان کی پاکیزہ فطرت کا حصہ ہے شکریہ کے الفاظ کہنے یا کم از کم سر یا ہاتھ ہلانے کے ذریعہ اس شخص کا عملی طور پر شکریہ ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ صفت حیوان میں نہیں پائی جاتی بلکہ یہ صرف انسان ہی کی خصوصیات سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے "**ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** (رحمٰن /۶۰) (کیا احسان کا بدلہ احسان کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟) یہ ایسا سوال ہے جس کی مخاطب انسان کی فطرت سلیم ہے اور انسان کا پاکیزہ وجدان اس کا جواب دیتا ہے۔

علیٰ ھذا القیاس یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو پہچان لے تو وہ خدا کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے' انتہائی عظیم اور درست حقیقت ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو کامل طور پر پہچان لینا ایک ایسا طریق ہے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ انسان کو پہچاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مخصوص انسانی جذبوں کا احساس کیا جائے۔ ان میں ایک یہی جذبہ سپاس ہے جس کا حکم انسان کا ضمیر دیتا ہے۔ اس کا تعلق گروہ پیش کی تعلیم و تربیت کے ساتھ نہیں' نہ ہی اس کا شمار معاشرتی آداب و رسوم میں ہوتا ہے اور نہ ہی یہ کسی خاص علاقہ کے ساتھ مختص ہے۔ آداب و رسوم زمان و مکان کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ تبدیل ہو کر بالکل برعکس ہو جاتے ہیں' مثلاً سر سے ٹوپی اتارنا یا سر پر ٹوپی رکھنا دونوں احترام کی علامت ہیں۔ لیکن ان میں ہر ایک کا رواج مختلف معاشروں میں مختلف ہے۔ کوئی معاشرہ ایسا نظر نہیں آتا جہاں بھلائی کا بدلہ برائی سے دیا جاتا ہو اور جواز یہ پیش کیا جاتا ہو کہ یہ مقامی آداب و رسوم کا

حصہ ہے۔

حمد نہ تو صرف مدح ہی کو کہتے ہیں اور نہ فقط سپاس کو۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیا ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں کو یکجا کر دیا جائے تو یہ حمد ہو گی۔ یعنی ایسا مقام جو عظمت' جلال' حسن' کمال' زیبائی کی بنا پر لائق ستائش ہو اور اپنی خوبیوں اور بھلائیوں کی بنا پر لائق سپاس بھی ہو تو اس کے لیے حمد کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حمد اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے

بعید نہیں کہ حمد کے معنی میں کوئی اور مفہوم بھی شامل ہو اور وہ ہے عبادت کا مفہوم۔ پس حمد کے مفہوم میں بیک وقت تین عنصر یعنی ستائش' سپاس اور عبادت شامل ہیں۔ بالفاظ دیگر حمد ایسی ستائش ہے جو سپاس و عبادت پر مشتمل ہو۔ لہٰذا اس آیت کے مطابق حمد اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے' اس کے علاوہ کوئی محمود نہیں ہے' اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ حمد کے مفہوم میں عبادت کا مفہوم بھی سمویا ہوا ہے۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ اگر لفظ حمد کے معنی میں سپاس کے ساتھ ساتھ عبادت پر مبنی خضوع و فروتنی کا مفہوم شامل نہ ہو اور حمد کے معنی فقط سپاس گزاری ہی ہوں تو انسان ان انسانی وسیلوں کا سپاس گزار کیوں نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے قرار دیئے ہیں؟۔ انسان کو ان کا شکر گزار و قدردان بھی ہونا چاہیے جن کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ اس پر اپنا کرم فرماتا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں تک کہا گیا ہے **"من لم یشکر المخلوق لم یشکر الخالق"** یعنی جو مخلوق کا سپاس گزار نہیں وہ خالق کا سپاس گزار بھی نہیں ہوتا۔ والد' والدہ' استاد اور وہ تمام افراد جن کے احسانات ہمیشہ انسان کے شامل حال رہتے ہیں' انسان کو ان سب کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ بہانہ بنا کر کہ چونکہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں اور بندوں سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے' ان کو ہرگز بھولنا نہ چاہیے' نہ ہی ان کی

جانب سے عطا ہونے والی نعمت کا شکر ادا کرنے سے دستبردار ہونا چاہیے۔ تاہم انسان کو اس جانب بھی متوجہ رہنا چاہیے کہ ایسا ہرگز نہیں کہ ایک مقام پر بندہ کا شکر گزار ہوا جائے اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا' بلکہ آپ جب بندہ کا شکریہ ادا کر رہے ہوں تو متوجہ رہیے کہ بندہ کی الگ کوئی حیثیت نہیں جو چیز انسان کو کسی بندہ کے توسط سے ملی ہو اس کے حوالے سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ ہی شکریہ کا مستحق ہوتا ہے۔

پس چونکہ حمد اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے معنی صرف سپاس گزاری ہی نہیں بلکہ یہ اپنے اندر ستائش اور عبادت کا مفہوم بھی لئے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ واحد ہستی ہے جو لائق عبادت ہے' رحمٰن و رحیم ہے' اس لیے ہم اس کی ستائش' اس کا سپاس اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حمد انسان کا ایک اندرونی پاکیزہ احساس ہے جو ہر انسان کی روح کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کا تقاضا ہے کہ انسان جلال و جمال کی توصیف کرے اور عظمت کے سامنے انکسار خضوع کرے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ حمد معرفت الٰہی کے لیے لازم ہے۔ یعنی انسان جب تک اللہ تعالیٰ کی مکمل معرفت حاصل نہ کرلے وہ سورۂ حمد کو صحیح معنی میں واقعی سورۂ حمد کے طور پر جو صرف زبان کا لقلقہ نہ ہو' نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ آپ کا سامنا ایک عظیم و بلند مرتبہ روحانی شخصیت سے ہوتا ہے جسے آپ بہت سے فضائل کا حامل پاتے ہیں نیز جب آپ کو اس سے کوئی ضرورت پیش آتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ اس شخصیت نے آپ کی توقع کے بغیر آپ کی حاجت روائی اور آپ کے ساتھ بھلائی کی ہے تو اب جب کہ آپ اس شخص کی روحانی عظمت کے معترف ہو چکے ہیں تو کسی محفل میں اگر اس کا نام آئے گا تو آپ اس کی تعریف کریں گے اور تہ دل سے اس کو اس طرح سراہیں گے جیسے ایک بلبل کسی پھول کے حسن سے متاثر ہو کر اس کی تعریف میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ یہ تعریف آپ کی روح کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اور آپ اس تعریف سے اپنے اندر لذت و راحت محسوس کرتے ہیں۔

نماز میں انسان پر اس قسم کی حالت طاری ہوتی ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے اور ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ عبادت پروردگار کی معرفت کا لازمہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی معرفت کامل نہ ہو عبادت عروج نہیں پاتی۔

یہاں دلچسپ اور قابل توجہ یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ الحمد للہ کے بعد چار دیگر صفات باری تعالیٰ بیان ہوئی ہیں۔ یعنی "رب العالمین" "الرحمٰن" "الرحیم" "مالک یوم الدین" جن میں ہر صفت حق تعالیٰ کی معرفت کا دروازہ ہے جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔

چونکہ حمد کو "اللہ" کے ساتھ جو لائق پرستش و ستائش ذات ہے، مختص کیا گیا ہے اس سے اس کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہونے کا پتہ چلتا ہے، یعنی وہ ایسی ذات ہے جو اپنی عنایات اور مجھ پر احسانات سے قطع نظر علم و دانش، اپنی قدرت تخلیق اور اس وسیع و عریض کائنات کی ابتدا و انتہا پر غور و فکر کرنے سے قبل ہی لائق حمد ہے۔ لہٰذا ہم پر اس کی حمد کرنا لازم ہے۔

لیکن اس کا دعویٰ کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ صرف حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی ہیں جو فرماتے ہیں۔

"الهی ما عبدتک طمعا فی جنتک ولا خوفا من نارک بل وجدتک اهلا للعبادة فعبدتک

یعنی "اے میرے پالنے والے! یہ جو میں تیری عبادت کرتا ہوں نہ تو تیری جنت کے لالچ کی خاطر ہے اور نہ ہی تیرے جہنم کے خوف سے ہے۔ اگر تو جنت و جہنم کو نہ بھی خلق فرماتا تب بھی میں تیری عبادت کرتا کیونکہ تو لائق عبادت ہے میرے عبادت کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تو نے مجھے خلق فرما کر مجھ پر احسان فرمایا، نہ ہی اس لیے کہ آخرت میں عبادت کرنے والوں کو تو بہشت مرحمت فرمائے گا بلکہ صرف اس لیے عبادت کرتا ہوں کہ تو عبادت کے لائق ہے۔ ۵۔

شیخ سعدیؒ کے بقول۔

گر از دوست چشمت باحسان اوست
تو در بند خویش نہ در بند دوست

خلاف طریقت بود کہ اولیاء
تمنا کنند از خدا جز خدا ۔۶

(ترجمہ: اگر تیرا مطمع نظر دوست کی نظر کرم ہے تو تو اپنی محبت میں گرفتار ہے دوست کی محبت میں نہیں۔ یہ بات طریقت کے خلاف ہے کہ اولیا اللہ تعالیٰ کی ذات سے خود اس کے سوا کسی اور چیز کی تمنا کریں۔)

رب العالمین

لفظ رب کے بارے میں بھی ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ فارسی زبان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو اس کا مترادف ہو۔ اس کے معنی "تربیت کنندہ" (یعنی تربیت کرنے والا) بھی کئے گئے ہیں لیکن جاننا چاہیے کہ "رب" کا لفظ "ربب" سے مشتق ہے "ربی" سے نہیں اور "تربیت کنندہ" (تربیت کرنے والا) لفظ "مربی" کا مترادف ہے کیونکہ مربی ربی سے نکلا ہے۔ رب کا ترجمہ صاحب اختیار بھی کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا تھا۔

"**انا رب الابل و للبیت رب** یعنی میں اپنے اونٹوں پر اختیار رکھتا ہوں جبکہ اس گھر پر بھی کسی کا اختیار ہے۔

بہرحال ان میں سے کوئی ایک لفظ رب کے معنی ادا نہیں کرتا۔ ہرچند کہ یہ دونوں صفات اللہ تعالیٰ کی الگ الگ صفات شمار ہوتی ہیں۔ تاہم لفظ رب میں مالک اور صاحب اختیار دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ اسی سے تکمیل کرنے والا اور پالنے والا بھی مراد لیا جاتا ہے۔ بس اللہ ہی کے پاس کائنات کا مکمل اختیار ہے اور وہی اس کو کمال سے ہمکنار کرنے والا بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسے عالم بھی خلق فرمائے ہیں جن میں بسنے والی مخلوق خصوصی دلائل کی رو سے شروع ہی سے اپنے اندر تمام کمالات کو لیے ہوئے ہے۔ بالفاظ دیگر ان میں کسی طرح کی استعداد یا توانائی نہیں پائی جاتی' بلکہ یہ سب مخلوق فعلیت سے ہمکنار ہے' یعنی ان کو ازل ہی سے تمام ممکنہ کمالات کے ساتھ خلق کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کا "**بخ**" اور "**عود**" یعنی ان کا آغاز و انجام ایک ہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی

مخلوق اور مبدع ہونے کی حیثیت سے اس کے مربوب ہیں جبکہ حق تعالٰی خالق و مبدع ہوتے ہوئے ان کا "رب" ہے۔

اس کے برعکس جس عالم میں ہم زندہ ہیں یعنی یہ دنیا یا جہان مادہ' یہ عالم تدریج ہے۔ اس میں یہ نظام برقرار ہے کہ موجودات کا آغاز نقص سے ہوتا ہے جو کمال کی جانب رجوع کرتی ہیں۔ ان کا "بدء" و "عود" ایک نہیں ہے۔ ان کا آغاز الگ ہے اور انجام الگ۔ وہ ایک حیثیت سے حق تعالٰی کی مخلوق ہیں اور دوسری حیثیت سے اس کی مربوب۔

طبیعات کا یہ عالم مجموعی طور پر دوسرے عوالم سے الگ ایک دنیا ہے کیونکہ اس میں طرح طرح کی انواع پائی جاتی ہیں جبکہ ہر نوع کا اپنا مخصوص نظام زندگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نوع کا اپنا ایک الگ عالم ہے اور تمام انواع اس طرح ہیں۔ عالم جمادات' عالم نباتات' عالم حیوان' عالم انسان' عالم افلاک' سب کے سب نقص سے کمال کی جانب گامزن ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک عالم بھی ابتدائے تخلیق سے کامل خلق نہیں کیا گیا۔ بلکہ اللہ تعالٰی ہی وہ ہستی ہے جو ان عوالم کی تمام موجودات کو کمال کی منزل آخر تک پہنچاتا ہے۔ وہی رب العالمین ہے۔

قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جہان پرورش کا ایک مقام ہے۔ انسان جو مختلف اچھے یا برے گروہوں میں منقسم ہیں' سب پرورش کی منازل میں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا گویا کھیتی باڑی کی منزل ہے۔ اس میں جو بیج بویا جاتا ہے' وہی نشوونما پاتا ہے۔ اس عالم میں فقط اچھے لوگ ہی منزل کمال سے بہرہ ور نہیں ہوتے ہیں بلکہ برے افراد یعنی "برائی کا بیج بونے والے" بھی یہاں کے نظام کے تحت اپنے مراحل طے کرتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد خداوندی ہے:

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها مانشاء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصليها مزموما مدحورا۔ ومن اراد الاخرة و سعى لها سعيها و هو مومن فاؤلئك كان سعيهم مشكورا۔ كلانمد هولاء و هولاء من عطاء ربك و ماكان عطاء ربك محظورا۔ (بنی اسرائیل / ۱۸ تا ۲۰)

یعنی جو شخص بھی دنیا کا طلبگار ہے ہم اس کو جلد ہی جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں پھر اس کے بعد اس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ داخل ہو گا۔ نیز جو شخص آخرت کا چاہنے والا ہے اس کے لیے ویسی ہی سعی بھی کرتا ہے' صاحب ایمان بھی ہے تو اس کی سعی یقیناً مقبول قرار دی جائے گی۔ ہم آپ کے پروردگار کی عطا و بخشش سے ان سب کی مدد کرتے ہیں اور آپ کے پروردگار کی عطا کسی کے لیے محدود نہیں ہے۔

ان آیات کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا طلبگار ہو اور دنیوی بیج بوئے' ہم اس کی مدد کرتے ہیں' اس کے بوئے ہوئے بیج کو اگاتے اور اس کی نشوونما کرتے ہیں لیکن فقط اس حد تک جہاں تک ہم چاہیں یا اس شخص کے لیے جس کا ہم ارادہ کریں۔ اس سلسلے میں ہماری یہ قطعی و ناقابل تبدیل سنت نہیں ہے کہ جو شخص بھی نقد اور جلد نتیجہ کا طالب ہو اسے لازمی طور پر وہی دے دیا جائے۔

دنیا طلبی کے بیج سے سو فیصد نتائج حاصل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا مزاحمتوں' آفتوں اور رکاوٹوں سے بھری پڑی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ دنیا ان بیجوں کی نشوونما کے لیے بنائی ہی نہ گئی ہو۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ جس شخص کا مطمع نظر فقط دنیا ہی ہو اور وہ شائستہ انسانی راستے سے بھٹک چکا ہو' تو اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ اس کے برعکس اگر کسی کا مقصد دنیوی نہ ہو آخرت کے لیے بیج بوئے' اسی کے لیے دوڑ دھوپ کرے تو اس کا یہ عمل ہرگز ضائع نہیں ہو گا بلکہ اپنے انجام تک پہنچے گا۔

"**کلا نمد هؤلاء و هؤلاء**" یعنی ہم بہر حال اس گروہ کی مدد کرتے ہیں اور اس گروہ کی بھی۔ الغرض! اس عالم کا نظام اس طور پر بنایا گیا ہے کہ جو شخص جو بیج بوئے گا دنیا اسی کے لیے منزل سعی ہے لہٰذا اسی بیج کی نشوونما کرتی ہے البتہ بعض بیج ایسے بھی ہوتے ہیں جو سو فیصد منزل تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ ایسے بیج ہی صراط مستقیم تک پہنچتے ہیں۔ بعض بیجوں میں نشوونما کی استعداد تو ہوتی ہے لیکن نتائج کلی تک پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ناشائستہ اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنی سعی کے تحت اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ اپنے

اعمال کے جواز میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر ہمارا کام ناجائز ہوتا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے۔ لہٰذا کوئی نظریہ اگر عملی طور پر کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی حقانیت کی دلیل نہیں۔ اس عالم میں **"کلا نمد ھولاء و ھولاء** کا نظام جاری ہے۔ لہٰذا ہر شخص کا بویا ہوا بیج اپنی نشوونما کو پہنچتا ہے اور کسی کو مطلوبہ نتیجہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

الرحمٰن الرحیم

ہم ان الفاظ کے بارے میں اس سے پیشتر کسی حد تک بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم مزید یہ کہتے ہیں کہ ان دو صفات کے ساتھ پروردگار عالم کی توصیف کرنے کے لیے بہت زیادہ معرفت کامل کی ضرورت ہے۔ رحمٰن کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رحمت فراواں ہے بلکہ اس کی رحمت کی حدود صرف اس منزل تک نہیں ہیں جو لفظ "فراواں" سے سمجھی جا سکیں' بلکہ مراد یہ ہے کہ تمام کائنات اسی سے ہے اور اس کی جانب سے ملنے والی ہر چیز رحمت و خیر مجسم ہے۔ اسی طرح رحیم کے معنی یہ ہیں کہ اس کا فیض ہمیشہ بنی نوع انسان تک پہنچتا رہتا ہے۔

ان دو صفات میں پہلی صفت کا تعلق نظام کائنات سے ہے اور دوسری عالم انسانیت سے مختص ہے پہلی صفت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی توصیف کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بندہ اس حد تک اس کی گہری معرفت رکھتا ہو کہ اسے تمام کائنات رحمت خداوندی میں غلطاں نظر آئے' ثنویت کا خیال تک اپنے ذہن سے نکال دے' دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کو خیر و شر میں تقسیم نہ کرتا پھرے' بلکہ کائنات کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے وجود ملنے کی حیثیت سے فقط رحمت و خیر محض جانے۔ یہ وہی مسئلہ ہے جس پر عدل الٰہی کے موضوع کے تحت بحث کی گئی ہے۔

یہ ایسی بات ہے جو بندہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے۔ وارد شدہ دعاؤں میں بھی اس کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی لیے نماز سے قبل کہی جانے والی مستحب تکبیروں میں پانچویں تکبیر کے بعد کی دعا میں آتا ہے۔

"لبیک و سعدیک و الخیر فی یدیک و الشر لیس الیک"

نماز پڑھنے والا بندہ اولیاء اللہ کے مقام پر کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ میں آ گیا ہوں' میں آ گیا ہوں' تیری رضا کے لیے آیا ہوں' ایک بہتر تعبیر کے ساتھ حاضر ہوتا ہوں!

"الخیر فی یدیک" یعنی خیر فقط تیرے قبضہ قدرت میں ہے۔ "

والشر لیس الیک" اور شر کی بازگشت تیری جانب نہیں ہوتی!

اللہ تعالیٰ کو رحمٰن کی صفت سے پہچاننا کائنات کو پروردگار کے نظام کامل اور اس حکمت بالغہ کے مکمل مظہر کے طور پر جاننے کے مترادف ہے۔ اس صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہوئے انسان کا نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ کائنات کا نظام خیر کا نظام' رحمت کا نظام اور نور کا نظام ہے۔ شر' نقمت اور تیرگی نسبتی اور غیر حقیقی امور ہیں۔ ظاہر ہے کہ خام خیال انسان ایسے نظریہ کا دعویدار نہیں ہو سکتا' انسان زبردستی اور عبودیت کے ذریعہ بھی اپنے آپ کو اس کا قائل نہیں کر سکتا۔ یہ جو قرآن چاہتا ہے کہ ہم ان صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توصیف کریں تو اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اسے اور کائنات کو اسی زاویہ نگاہ سے دیکھیں۔ لہٰذا ایسی معرفت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحیح عقلی اور برہانی طریق سے دقیق و عظیم مطالب کا ادراک کریں۔ یہ ضمنی طور پر الٰہیات کے مسائل میں غور و فکر کی دعوت اور ایسی معرفتوں کے امکان کی تائید ہے۔

دوسری صفت جو کہ "رحیم" کہلاتی ہے' کے بارے میں ہمیں یہاں یہ کہنا چاہیے کہ اس صفت کے ساتھ اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس بات سے پورے طور پر آگاہ و باخبر ہو کہ کائنات کے موجودات کے مابین خود اس کو مقام و واقعیت کے اعتبار سے کونسا مقام کامل حاصل ہے!

انسان کو اس عالم کے موجودات میں جو امتیازی کیفیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کا بالغ فرد ہے۔ وہ ایسی نابالغ اولاد نہیں جو والدین کی جبری سرپرستی میں زندگی بسر کر رہی ہو' بلکہ وہ عقل و خرد کے اعتبار سے اس مقام کو پا چکا ہے کہ اس سے کہا گیا ہے کہ اپنا راستہ خود منتخب کرے' جبکہ دیگر موجودات اس کائنات کے جبری عوامل کے تابع ہیں۔ انسان ہی ہے جو اپنی عقلی ترقی کی بنا پر آزادی و اختیار بداماں ہے کہ دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا" (دہر/۳)

(یقیناً ہم نے اسے راستہ کی ہدایت کر دی ہے اب چاہے تو شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کا مرتکب ہو۔)

انسان کے سامنے صحیح و غلط دونوں راستے موجود ہیں۔ اگر انسان راہ راست یعنی صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی ایک خاص رحمت و عنایت اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ کائنات کا نظام اس طور پر بنایا گیا ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ کے راستہ پر چلتا ہے حق تعالیٰ اس کی مدد، رہنمائی اور ہدایت فرماتا ہے۔

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (عنکبوت/۶۹)

(یعنی اور جن لوگوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے)

اس کے دل کو نور و قوت عطا فرماتا ہے، اسے اسباب بہم پہنچاتا ہے، اسے **من حیث لا یحتسب** کا رزق عطا فرماتا ہے، آخر کار انسان اس مقام تک جا پہنچتا ہے کہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے اللہ کی داد و ستد کے مرحلہ پر پہنچ چکا ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ جس قدر زیادہ اخلاص کے ساتھ اعمال انجام دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی زیادہ عنایات اس کے شامل حال ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ تسلیم و رضا کے مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے۔

مالک یوم الدین

آپ توضیح المسائل کی کتابوں میں پڑھ چکے ہوں گے کہ نماز میں اس آیت کو دو طرح سے یعنی **مالک یوم الدین** اور **ملک یوم الدین** پڑھا جا سکتا ہے۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دو طریقوں سے پڑھنا اس بات کا موجب بنتا ہے کہ اس آیت کے معانی بھی مختلف ہو جائیں؟ روزمرہ کے استعمال میں **ملک** اور **مالک** ہر ایک کے الگ معنی ہیں۔ اول الذکر کا تعلق سیاست سے ہے جبکہ

موخرالذکر اقتصاد سے متعلق ہے۔ جب انسان کسی چیز کا مالک بن جاتا ہے تو اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جبکہ ملک سے مراد یہ ہے کہ اس کو کسی دوسرے شخص پر ایک طرح کی فوقیت حاصل ہے۔ جس کے تحت وہ تدبیرو سیاست کو اپنا حق گردانتا ہے۔ تاہم دونوں باتوں میں کسی طرح کی واقعیت لازم نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک سمجھوتہ ہے' یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں گھر کا مالک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فی الوقت اس طرح فرض کر لیا گیا ہے۔ اس کے برعکس جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں علاقے کا ملک ہے تو اس کی حیثیت بھی ایک اعتبار سے زیادہ نہیں ہوتی لہٰذا دونوں میں جونہی شرط اعتبار تبدیل ہو جائے تو مذکورہ تعلق منقطع ہو جاتا ہے' یعنی ممکن ہے کہ اگلے ہی لمحہ گھر کا مالک یا علاقہ کا ملک کوئی دوسرا شخص ہو جائے تو گھر اور علاقہ کا تعلق نئے لوگوں سے قائم ہو جائے گا۔ ان موارد میں جہاں اعتبار کی شرط پر ملک اور مالک بنا جاتا ہے' ان دونوں معانی میں بہت فاصلہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ملک مالک کے لیے کام نہیں کرتا اور مالک ملک کے کام نہیں کر سکتا۔ دراصل ایک ملک ہے' دوسرا مالک' بعض صورتوں میں یہ تعلقات حقیقی ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ وہ اپنے قوائے جسم کا مالک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان قویٰ کو کام میں لانے کا مکمل حق و اختیار رکھتا ہے۔ یعنی اس میں ایسی قوت موجود ہے کہ جب چاہے اس سے فائدہ اٹھاتا رہے' یعنی وہ اپنے اختیار سے جب چاہے قوائے جسمانی سے کام لے سکتا ہے۔ اور جب نہ چاہے تو ان سے کوئی کام نہ لے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مقام پر مالک و ملک دونوں کا مصداق ایک ہی ہے' یعنی ہم اپنے اعضائے جسم کے مالک بھی ہیں اور ان پر تسلط بھی رکھتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ ایک تکوینی امر ہے مجازی نہیں۔

پروردگار عالم جو تمام کائنات کا خالق ہے' اور اس کا ارادہ ساری کائنات پر حکم فرما ہے' کے حوالہ سے ملک اور مالک کا ہم معنی ہونا بخوبی واضح ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے حوالہ سے مالک و مملوک کے مابین حقیقی رابطہ سمجھ میں آتا ہے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے قیامت کا ذکر کرتے ہوئے ملک کے بارے میں فرمایا ہے۔

"لمن الملک الیوم للّٰہ الواحد القھار" (مومن / ۱۶)

(آج کس کا ملک ہے۔ صرف خدائے واحد و قہار کا۔)

ایک اور آیت میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے:

"قل اللھم مالک الملک" (آل عمران / ۲۶)

(آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تو (کائنات میں) صاحب اختیار ہے۔)

کہو! "اے ملک کے مالک پروردگار!" اس آیت میں ملک اور اختیار کے باب میں صاحب اختیار کو ایک امر مملوک فرض کیا گیا ہے۔ **"لمن الملک الیوم"** کا مفہوم بھی یہی ہے اور "لام" ملک کی نشاندہی کر رہا ہے۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ مالک کون ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ ہی مالک ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ملک اور ملک میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ دونوں کی حدود الگ الگ ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ صرف روز قیامت ہی کا مالک و ملک ہے دنیا کا نہیں؟ ایسا نہیں۔ بلکہ پروردگار عالم دنیا کا بھی حقیقی مالک اور ملک ہے اور آخرت کا بھی۔ درحقیقت انسان چونکہ دنیا میں حقیقت کو دیکھنے والی آنکھ سے محروم ہے اس لیے وہ مجازی و اعتباری مالکوں اور ملکوں کو حقیقی مالک و ملک جاننے لگتا ہے یعنی وہ اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو اشیا کا مالک و ملک سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس گھر کا مالک ہوں۔ لیکن جب کائنات کے حقائق اس پر کھلیں گے اور وہ حقیقت بین نگاہ اس جہان پر ڈالے گا تو جان لے گا کہ یہ تمام مالک و ملک جعلی تھے' حقیقی مالک و ملک صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے **"فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید"** (ق / ۲۲) (پس ہم نے تمہارے پردوں کو اٹھا دیا ہے اور اب تمہاری نگاہ بہت تیز ہو گئی ہے۔)

درج ذیل روایت بھی اس مطلب کو بیان کر رہی ہے:

"عن جابر عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال الامر یومئذ و الیوم کلہ للّٰہ یا جابر اذا کان یوم القیامۃ بادت الحکام فلم یبق حاکم الا اللّٰہ" ۷۔

(جابرؓ سے منقول ہے کہ حضرت ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن' نیز آج بھی حکم اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ اے جابرؓ! جب قیامت آئے گی تو تمام حاکم نابود ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی حاکم باقی نہ رہے گا۔)

ایاک نعبد و ایاک نستعین

(پالنے والے! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

انسان کا گمان ہے کہ توحید اسلام کے مسائل میں سے ایک ہے اور اسلام میں توحید کے پہلو میں ہزارہا دیگر مسائل پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ بنظر غائر دیکھتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اسلام سراپا توحید ہے' یعنی تمام مسائل خواہ ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق و تربیتی امور سے یا روز مرہ کے احکام سے ہو' سب کے سب توحید میں شامل ہیں۔ "تحلیل و ترکیب" منطق کی اصطلاحیں ہیں۔ یہ دو لفظ علوم طبیعی سے لئے گئے ہیں۔ ان سے مراد یہ ہے کہ جس طرح عالم مادی میں تجزیہ و ترکیب ہوتی ہے۔ یعنی تمام مرکبات کو ان کے ابتدائی عناصر میں تقسیم کیا جا سکتا ہے' پھر اگر ان عناصر کی ترکیب عمل میں لائی جائے تو دوبارہ وہی مرکب تشکیل پا جائے گا۔ افکار و خیالات کا بھی یہی حال ہے۔ فلاسفہ کا کہنا ہے کہ انسان کے تمام افکار و خیالات کی بازگشت "عدم تناقض" کے اصول کی جانب ہے' یعنی اگر ان کا تجزیہ و تحلیل ہو تو ان کی بازگشت اسی بدیہی اور مسلمہ اصول کی جانب ہو گی۔

اسلام میں ایسا ہی اصول موجود ہے جس کا نام توحید ہے' یعنی اگر ہم اسلام کے تمام اصول و مبانی کا تجزیہ کریں تو سب کی بازگشت توحید ہی کی جانب ہو گی۔ درحقیقت اگر ہم نبوت و معاد کا' جو ہمارے عقائد کے دیگر دو اصول ہیں' یا امامت کا تجزیہ کریں تو توحید ہی کی دوسری صورت پیدا ہو گی۔ اسی طرح اگر ہم اخلاقی یا اجتماعی احکام کا تجزیہ کریں تو یہ بھی ہمارے سامنے توحید ہی کی شکل میں جلوہ گر ہوں گے۔ فی الحال ہم اسی قدر اس بحث پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کی مزید وضاحت کسی اور مقام کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ تفسیر المیزان میں یہ مطلب متعدد

مقامات پر بیان ہوا ہے۔

توحید نظری اور توحید عملی

اسلام میں توحید کے دو شعبے ہیں: نظری و عملی۔ توحید نظری کا تعلق شناخت اور فکر کی دنیا سے ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا توحید عملی کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو عمل کے اعتبار سے ایک' یک پہلو اور ذات میں یگانہ بنانا۔ بالفاظ دیگر توحید نظری کے معنی اللہ تعالیٰ کے واحد ہونے کی معرفت حاصل کرنا اور توحید عملی کے معنی انسان کا خود یگانہ ہونا ہیں۔

میں اس نکتہ کو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سورۂ حمد کے آغاز سے لے کر یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا تعلق پہلی قسم یعنی توحید نظری سے ہے جبکہ یہاں (ایاک نعبد) سے توحید عملی کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہیں سے انسان کو اس چھوٹی سی سورہ کی بے نظیر عظمت کا پتہ چلتا ہے اور وہ اس کتاب کے معجزہ ہونے کا واضح نمونہ اس چھوٹی سی سورت میں پا لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی حیرت کو چھپا نہیں سکتا کہ ایک ایسا شخص جو کسی سے درس لینے والا نہیں' امیت و جہالت کے اور علم و ثقافت سے نابلد ماحول میں رہنے والے کی زبان پر ایسا کلام کیونکر جاری ہو سکتا ہے جو اپنے عمق کی وجہ سے عظیم ترین حکمائے الٰہی کو ورطہ حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ نیز شیرینی و روانی زبان کے اعتبار سے اس درجہ پر ہے کہ انسان اس کے دہرانے سے کبھی سیر نہیں ہوتا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے سورہ سے لے کر **مالک یوم الدین** تک جو جملے و الفاظ گزرے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی معرفت سے متعلق مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہی **"اللہ"** ہے' وہی **"رحمٰن"** ہے وہی "رحیم" ہے' وہی **"رب العالمین"** ہے اور وہی **"مالک یوم الدین"** ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایسی ذات ہے جو "محمود" علی الاطلاق ہے' تمام تعریف و سپاس کا تعلق اسی سے ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف تمام الٰہیات کو ان چند لفظوں میں سمو دیا گیا ہے' بلکہ عمدہ ترین مسائل الٰہی کو ان چند لفظوں میں بیان کرایا گیا ہے۔

علما و حکمائے اسلام اس سے یہ استنباط کرنے میں حق بجانب ہیں کہ قرآن کریم کی جانب سے ان مسائل کا بیان کیا جانا ان حقائق پر عمیق غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کریم نہیں چاہتا کہ ہم ان الفاظ کو فقط زبان ہی سے ادائیگی تک محدود رکھیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ ہم ان حقائق کا ادراک کریں۔

نماز میں اللہ تعالیٰ کو مذکورہ اوصاف کے ساتھ یاد کرنے والا شخص حقیقت میں مدعی ہوتا ہے کہ وہ ان اسما و صفات کے ساتھ خداوند متعال کی معرفت رکھتا ہے۔ اس بات کی معرفت لازم ہے کہ وہ "اللہ" ہے' یعنی وہی کامل و قابل پرستش ذات ہے جس کی طرف تمام موجودات عالم اپنی فطرت کی بنا پر متوجہ ہیں' بالفاظ دیگر ایسی ذات کی معرفت' اقرار و اعتراف جو کامل مطلق ہے' اس میں کس طرح کا نقص' کمی یا عدم نہیں ہے' یہی وجہ ہے کہ تمام چیزیں اسی سے ہیں اسی کی طرف متوجہ اور اسی کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔

یہ معرفت کہ وہ رحمٰن ہے۔ واقعی (جیسا کہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں) انسان کو اپنے افکار بہت زیادہ دقیق و لطیف کرنا ہوں گے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس صفت کے ساتھ پہچان سکے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان جان لے کہ وجود ذات باری تعالیٰ رحمانیت کامل کا مظہر ہے۔ اس سے صادر ہونے والی ہر شے خیر و رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ ہر موجود اس اعتبار سے وجود رکھتا ہے' اس اعتبار سے کہ وہ ذات باری تعالیٰ سے نسبت رکھتا ہے' یعنی اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ یقینی و واقعی ہے۔ خیر و رحمت کے علاوہ نہیں' مخلوقات میں پائے جانے والے شر و نقمت کا تعلق ان کے عدمی و نسبی پہلو سے ہے ان کے وجودی پہلو سے نہیں ہے' یعنی اشیا کی ذات میں شر نہیں ہے۔-۸

یہ شناخت کہ وہ رحیم ہے' اللہ تعالیٰ کو اس صفت کے ساتھ پکارنے والا شخص مدعی ہوتا ہے کہ وہ معرفت و شناخت کے اس مرحلے پر پہنچ چکا ہے' کہ وہ نہ صرف اشیا' جو ذات حق تعالیٰ کی مظہر ہیں' کے نظام خلق و صدور کی معرفت رکھتا ہے' بلکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب اشیا کی بازگشت کا نظام بھی خیر و رحمت کا نظام ہے۔ یعنی موجودات رحمت سے آتی ہیں اور رحمت ہی کی طرف پلٹتی ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحمت کو غضب و نقمت پر سبقت و تقدم حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر اگر نقمت و عذاب کو بھی صحیح زاویہ نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ بھی رحمت ہی ہیں جو عذاب کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات جمال و جلال کا مالک ہے۔ صفات جمال مثلاً علم و قدرت' حیات' جود' رحمت اور صفات جلال قدوسیت' جباریت اور منتقمیت وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں دوگانگی نہیں ہے' یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کی آدھی ذات رحمت' خیر' جود و ربوبیت سے عبارت ہو اور باقی آدھی ذات قدوسیت' جباریت اور انتقام سے۔ اسی طرح خداوند متعال جس حیثیت و مرتبہ میں خیر' جود اور رحمت ہے اسی حیثیت و مرتبہ میں جبار و منتقم نہیں ہے بلکہ اس کے اسما و صفات میں ایک طرح کا تقدم و تاخر حکم فرما ہے۔ اہل حکمت و معرفت نے اس حوالہ سے بہت دلچسپ و عمیق تحقیقات کی ہیں جو انسانی فکر کا گراں بہاترین ماحصل ہیں۔ ان حقائق کی تہہ تک صرف وہی افراد پہنچے ہیں جو پورا ذوق رکھنے کے علاوہ دقیق نظر اور انتھک محنت کے حامل تھے۔

دراصل اللہ تعالیٰ کے اسما و صفات کے مابین ایک طرح کا تقدم و تاخر حکم فرما ہے' یعنی بعض اسما و صفات بعض دیگر اسما و صفات سے پیدا ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر صفات جمالیہ صفات جلالیہ سے مقدم ہیں کیونکہ صفات جلالیہ صفات جمالیہ ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔ جس کی جباریت و جذبہ انتقام دوسری ہر چیز پر مقدم ہے وہ یہودیوں کا مصنوعی خدا "یہو" ہے' "اللہ" نہیں جو کائنات کا حقیقی پروردگار ہے اور جس کی قرآن مجید نے معرفت کرائی ہے۔ اس طرح یہ بات باسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قرآن کریم میں "بسم اللہ" "رحمٰن" و "رحیم" کے ساتھ مل کر کیوں آئی ہے' منتقم جبار کے ساتھ کیوں نہیں آئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں کائنات پروردگار رحمٰن و رحیم کی مظہر ہے' یعنی جباریت و صفت انتقام رحمانیت و رحیمیت کی دوسری شکل ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ رحمت رحیمیہ سے مراد وہ رحمت ہے جو حق تعالیٰ کی جانب

لوٹنے والی موجودات کے شامل حال ہوتی ہے۔ پہلے درجے میں یہ اہل ایمان کے شامل حال ہوتی ہے۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان تک پہنچتا ہے وہ ظاہرو باطن میں رحمت ہی رحمت ہے۔ یہ ایسی رحمت ہے جو اپنی اصل صورت میں ہے عذاب کے لبادے میں نہیں۔ یہی رحمت مطلقہ ہے رحمت نسبی نہیں۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ رحمٰن و رحیم میں یہ فرق ہے کہ رحمٰن دنیا سے متعلق ہے اور رحیم آخرت سے یا یہ کہ رحمان کا تعلق تمام لوگوں سے ہے وہ کافر ہو یا مومن جبکہ رحیم کا تعلق فقط مومنین سے ہے تو اس سے مراد وہی ہے جس کی وضاحت ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔

دنیا و آخرت میں اس لحاظ سے کہ یہ دو الگ عالم ہیں یہ فرق نہیں پایا جاتا کہ ایک عالم کی رحمت کا مادہ رحمٰن ہے اور دوسرے کی رحمت کا مادہ رحیم یا مثلاً یہ کہ کافروں اور مومنوں کے شامل حال ہونے والی مشترکہ رحمتیں ایک مادہ سے متعلق ہیں اور اہل ایمان کی رحمتیں دوسرے مادے سے۔

کائنات میں اس طرح کی تقسیمات نہیں پائی جاتیں۔ رحمت کے اقتباز سے کائنات کی تقسیم یہ ہے کہ کائنات کی ایک "آمد" ہے اور ایک "بازگشت" کائنات ایک ذات سے آئی ہے اور اسے اسی ذات کی جانب ہی پلٹنا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے یعنی کائنات کی خلقت رحمت کا مظہر ہے' اللہ تعالیٰ رحیم ہے' یعنی کائنات کی بازگشت اس کی جانب ہے اور یہ بات بھی رحمت کی مظہر ہے' حتیٰ کہ جہنم و عذاب الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کی جباریت اور اس کے انتقام کے مظہر ہیں وہ اس کی رحیمیت ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس سے زیادہ وضاحت کی گنجائش نہیں۔

وہ **مالک یوم الدین** ہے۔ اس آیت میں ایک اور معرفت اور شناخت کو بیان کیا گیا ہے۔

بندہ انجام آفرینش کی معرفت کا مدعی ہوتا ہے یعنی وہ جانتا ہے کہ ایک روز جزا ہے جس دن منکشف ہو جائے گا کہ کوئی سبب و وسیلہ اصالت کا حامل نہیں اور یہ فقط خداوند متعال کی ذات ہے جو بالاصالت ملک و مالک ہے۔

یہ سب باتیں اور جو وضاحت اس سے قبل کی گئی ہے ان سب کا تعلق

توحید نظری سے ہے یعنی یہ ایسی توحید ہے جس کا تعلق شناخت و معرفت کے ساتھ ہے جو انتہائی ضروری ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہنا چاہیے کہ یہ ایک ذہنی مرحلہ ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اسلام میں معرفت کی اپنی ایک اصالت ہے اور جب تک یہ مرحلہ طے نہ ہو جائے انسان عمل میں پیش رفت نہیں کر سکتا۔

لیکن کیا یہی مرحلہ کافی ہے؟ یعنی اگر انسان صرف یہ جان یا سمجھ لے تو کیا وہ موحد شمار ہو سکے گا؟

ایسا نہیں بلکہ یہ "پہچاننا" اور "معرفت حاصل کرنا" "موجویت" کا مقدمہ ہے۔ یعنی انسان کے لیے "پہچاننا" اور "معرفت حاصل کرنا" لازم ہے تاکہ وہ حامل وجود قرار پائے۔ (یہ توحید عملی ہے) لہذا جب ہم ایاک نعبد کہتے ہیں تو ہم توحید عملی کا آغاز کرتے اور چاہتے ہیں کہ (اللہ تعالی کے) یگانہ ہونے کا اظہار کریں۔

لفظ "عبادت" کا مادہ

جب کوئی چیز اس حد تک نرم اور مطیع ہو جائے کہ اس میں کسی طرح کی نافرمانی، سرکشی اور مزاحمت کا شائبہ باقی نہ رہے تو ایسی حالت کو عربی زبان میں "تعبد" کہا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں عصر حاضر کی طرح راستوں کو مشینوں کے ذریعہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ نہ ہی راستہ بنانے کے بعد اس پر آمد و رفت کا آغاز کیا جاتا تھا، بلکہ راہ چلنے سے راستے خود بخود بن جاتے تھے۔ اس لیے ابتدا میں پتھر و کانٹے آمد و رفت میں مانع ہوتے تھے۔ مسلسل آمد و رفت سے سنگریزے و پتھر رفتہ رفتہ نرم اور چھوٹے ہو جاتے اور آمد و رفت میں مزاحمت نہ کرتے، یہ پتھر پھر انسانوں اور دیگر جانداروں کے لیے باعث آزار نہیں رہتے تھے بلکہ نرم اور ہموار ہو جاتے تھے۔ جس راستے پر آمد و رفت نہیں ہوتی تھی اس کے پتھر پاؤں کو اذیت پہنچاتے تھے۔ ایسے راستہ کو جو نرم و ہموار ہو چکا ہوتا تھا طریق معبد کہا جاتا۔ ۹۔

عبد و معبد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بالکل منظم، سراپا تسلیم اور مطیع ہو چکا ہو اور اس میں کسی طرح کی سرکشی نہ پائی جاتی ہو۔ اس طرح کا ہونا یعنی منظم و

مطیع بن جانا' معمولی سا بھی نافرمان نہ ہونا' انسان کی ایسی حالت ہے جو صرف خداوند متعال کے حضور ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا عبد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان حق تعالیٰ کی ذات نیز اس کے احکامات کے سامنے ایسی حالت اپنے اندر رکھتا ہو۔ اسی طرح انسانی ذہن میں بندگی و عبادت اور تصور توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی دوسری ذات اور کسی حاکم کے سامنے یہ کیفیت نہ رکھتا ہو بلکہ غیر خدا کے لیے اس میں سرکشی و نافرمانی کی حالت پائی جاتی ہو۔ پس انسان کو ہمیشہ دو متضاد کیفیات کا حامل ہونا چاہیے' اللہ کے سامنے سراپا تسلیم اور غیر خدا سے مکمل سرکشی۔ یہی معنی ہیں **ایاک نعبد** کے یعنی یا اللہ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔

جاننا چاہیے کہ والدین' امام و جامع الشرائط رہبر جن کی اطاعت کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس لیے ہم ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس معیار کا ہر کام عبادت خدا ہے۔ اس کے برعکس ہر کام جو کسی نوعیت سے بھی حکم الٰہی سے متصادم ہو شرک کہلائے گا۔

شرک و توحید

قرآن مجید میں شرک کے مختلف مصادیق بیان ہوئے ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے کسی حد تک قرآن میں بیان کی گئی توحید عملی بھی مختصر طور پر واضح ہو جائے گی۔

۱۔ "**افرایت من اتخذ الٰهه هواه**" (جاثیہ / ۲۳)

کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟

اس آیت میں شہوت پرست (یعنی خواہشات نفسانی کے تابع) انسان کو مشرک قرار دیا گیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

مادر بت ہا بت نفس شماست

چونکہ آن بت مار و این بت اژدہا ست
آہن و سنگ است نفس و بت شرار
آن شرار از آب میگیرد قرار
سنگ و آہن ز آب کی ساکن شود
آدمی با این دو کی ایمن شود

(ترجمہ: تمام بتوں کی اصل تمہارے نفس کا بت ہے کیونکہ وہ بت سانپ ہے جبکہ یہ بت اژدہا ہے۔ نفس لوہا اور پتھر ہے جبکہ بت شرر ہیں۔ یہ شرر پانی کے ساتھ قرار پاتا ہے۔ پتھر و لوہا پانی سے کیسے پرسکون ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں کے ہوتے ہوئے آدمی کو امن کہاں حاصل ہو سکتا ہے؟)

پس جب ہم **"ایاک نعبد"** کہتے ہیں اور غیر خدا کے معبود ہونے کی نفی کرتے ہیں تو ہم اس بات کا اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ بار الہا ہم تیرے فرمان بردار ہیں اپنی خواہشات' شہوتوں اور ہویٰ و ہوس کے نہیں۔

۲۔ **"اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللّٰہ"** (توبہ / ۳۱)

(یعنی ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں' راہبوں اور مسیح ابن مریم کو اپنا رب بنا لیا ہے۔)

قرآن مجید یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اپنے مذہبی عالموں اور راہبوں کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور ان کی ہی عبادت کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ یہودی و عیسائی اپنے علما و مقدس شخصیتوں کی اس طرح عبادت نہیں کرتے تھے جیسے بت پرست اپنے بتوں کی کرتے تھے۔ وہ انہیں سجدہ تو نہیں کرتے تھے بلکہ صرف یہی تھا کہ وہ ان کے سامنے متعبد تھے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر ان کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرتے تھے۔ در حقیقت وہ ان کی رضامندی اور خواہشات نفسانی کے مطیع تھے۔ جو کچھ وہ اپنی خواہش کی بنا پر کہتے یہ اس کو بجا لاتے۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اطاعت پروردگار کے خاص حقوق میں سے ہے۔ جس شخص کی اطاعت کا وہ حکم دے صرف اس کی

اطاعت کرو۔ اس نے احبار اور راہبوں کی اطاعت کا حکم نہیں دیا پھر تم ان کی اطاعت و پیروی کیوں کرتے ہو؟

پس جب ہم "**ایاک نعبد**" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہم کسی روحانی عالم' قدیس یا کسی اور نام کے کسی شخص کی عبادت نہیں کرتے' ہم کورانہ اطاعت بھی نہیں کرتے جس کے بارے میں تو نے حکم دیا ہے ہم صرف اسی کی اطاعت کرتے ہیں اور جس کے بارے میں تو نے حکم نہیں دیا ہم اس کی اطاعت نہیں کرتے۔ اگر ہم رسول خدا کی اطاعت کرتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تو نے صراحت کے ساتھ آنحضرتؐ کا فرمان بجا لانے کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر ہم ائمہ طاہرینؑ کو اولی الامر مانتے ہوئے ان کی اطاعت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر ہم جامع الشرائط مجتہدین یعنی متقی' عادل اور دانشمند علما کی اطاعت کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ اکرم اور ائمہ طاہرینؑ جن کا حکم ماننا تو نے واجب قرار دیا ہے' نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

۳۔ "**قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ و لا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ**" (آل عمران / ۶۴)

یعنی اے پیغمبرؐ! کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک منصفانہ بات پر اتفاق کرلیں کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں' کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو معبود کا درجہ نہ دیں۔

یہ وہی آیت ہے جسے رسول اللہؐ نے ۵ یا ۶ ہجری میں دستور العمل کے طور پر سربراہان عالم کو بھیجا تھا۔

کہہ دیجئے کہ اہل کتاب! اے وہ لوگوں جو اپنے لیے ایک الہامی کتاب کو سند جانتے ہو' آؤ ہم سب ایک حقیقت کی طرف رجوع کریں جو ہم سب کے لیے مشترک ہے' نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دعویٰ ہمارے لیے مخصوص ہے اور نہ ہی تم اس کے اپنے لیے خاص ہونے کا دعویٰ کرسکتے ہو' وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک

ہے۔ آؤ! کسی شے کو اس کا شریک قرار نہ دیں' حتیٰ کہ ارشاد ہوتا ہے!

ولا یتخذ بعضنا بعضا.....

ہم میں کوئی کسی دوسرے کو اپنا رب' مالک نہ بنائے کوئی کسی دوسرے کی عبادت و اطاعت نہ کرے بلکہ ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا رب' معبود اور مطاع جانیں۔

قرآن مجید کی یہ آیت بھی توحید عملی کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنا رب قرار نہ دے' نہ ہی کوئی شخص کسی دوسرے کا مربوب بن بیٹھے۔ پس **ایاک نعبد** کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم صرف تجھے ہی اپنا رب و مطاع جانتے ہیں اور ہمارا کوئی اجتماعی معبود نہیں ہے۔ ہم کسی انسان کو یا کسی انسانی حکم کو تیری ذات اور تیرے فرمان کے مقابلے میں قابل اطاعت نہیں جانتے۔

۴۔ **"و تلک نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل** (شعراء/۲۲)

یعنی یہ احسان جو تربیت کے سلسلہ میں تو جتا رہا ہے تو تو نے بڑا غضب کیا کہ بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا۔

جب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے فرعون کے پاس جا کر اسے حق کی دعوت دی تو فرعون نے رعونت کے ساتھ کہا کہ تو وہی تو ہے جس نے ہمارے گھر میں پرورش پائی' ہماری نگرانی میں بڑا ہوا اور وہ بہت برا کام انجام دیا (قبطی کے قتل کی جانب اشارہ ہے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تو مجھ پر یہ احسان جتا رہا ہے حالانکہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ یعنی کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تو نے جو بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے تو میں اس کے خلاف تجھے کچھ نہ کہوں؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون مابی یعنی فرعون کے استبداد کو "تعبید" کا نام دیا ہے جبکہ بنی اسرائیل کبھی فرعون کو سجدہ نہیں کرتے تھے بلکہ فرعون نے انہیں ذلیل کر رکھا تھا انہیں اپنی اطاعت پر مجبور کیا ہوا تھا ان سے جبرا کام لیتا تھا اور ہر طرح کا اختیار و آزادی کا حق ان سے سلب کر

رکھا تھا۔ وہ عملی طور پر فرعون کے سامنے غلام و مطیع بنے ہوئے تھے۔ پس "**ایاک نعبد**" کے معنی یہ ہوئے کہ بار الہا ہم تیمید تذلیل اور جبری اطاعت قبول نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی آزادی و اختیار کا حق سلب ہونے دیں گے۔

یہ ایسے نمونے ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اور ان سے توحید عملی کی وضاحت ہوتی ہے۔ توحید عملی وہی ہے جس کو مسلمان علما "عبادت میں توحید" کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں' جس سے حیثیت خارجی میں توحید مراد ہے یعنی یہ کہ انسان کے وجود کی واقعیت بھی یگانہ ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اسلام کے نزدیک یہی کافی نہیں کہ مسلمان فقط فکر و خیال کی حد تک موحد ہو' اللہ کی ذات' صفات اور افعال کی یگانگت کا قائل ہو اور جانتا ہو کہ اگر اسے اللہ تعالیٰ کے متعلق تقریر کرنے کو کہا جائے تو چھ ماہ تک متواتر ہی کر سکے۔ ایسا شخص آدھی توحید رکھتا ہے جبکہ نصف دیگر توحید یہ ہے کہ وہ اپنے عمل میں توحید کی جانب مائل ہو بلکہ موحد ہو۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کو تمام صفات کے ساتھ پہچانے اور اطاعت و تسلیم میں بھی یگانہ ہو اس وقت اس کو موحد کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں اسی سے ہمیں سورۂ حمد کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ واقعی حیرت انگیز بات ہے کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی کسی سے سبق نہ لیا ہو' کسی فلسفی سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہو' کسی دانشمند سے نہ ملا ہو' اس نے اپنی کتاب کی پہلی ہی سورت کے جملوں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پورا مکتب فکر ایک چھوٹی سی سورت میں سمو دیا ہے' توحید نظری کو چند مختصر جملوں میں کمال عظمت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور توحید عملی کو ایک چھوٹے سے جملے **ایاک نعبد** میں بیان فرما دیا ہے۔

عبادت کا انحصار:

عربی زبان کے قواعد کی رو سے "**ایاک نعبد**" کے جملے میں **ایاک** مفعول ہے **نعبد** کا۔ قاعدہ کے مطابق اس کو فعل (یعنی **نعبد**) کے بعد آنا چاہیے تھا اور **نعبدک** ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس طرح ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ اے خدا ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ لیکن علمائے ادب کہتے ہیں کہ "**تقدیم ما حقہ**

التاخیر یفید الحصر" یعنی اگر کسی لفظ کی جگہ بعد میں ہو اور اسے پہلے لایا جائے تو یہ اختصاص کی علامت ہوتی ہے۔ یہ بات عربی زبان ہی کے لیے مخصوص نہیں بلکہ فارسی میں بھی ایسا ہی ہے۔ لہٰذا اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدایا ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور صرف تیرے سامنے ہی تسلیم و مطیع ہیں کسی دوسرے شخص یا ایسے حکم کے مطیع نہیں ہیں جس کے بارے میں تیرا فرمان نہ ہو۔ پس **ایاک نعبد** ایک جملہ ہے جو کہ دو جملوں کا قائم مقام ہے۔ یعنی ایک مثبت جملے کا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی سر تسلیم خم کرتے ہیں اور دوسرا منفی کا یعنی ہم غیر خدا کے سامنے ہرگز سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

بنا بریں اس جملے میں ہی ایمان اور کفر کو سمویا گیا ہے جس کا پتہ کلمہ توحید سے چلتا ہے۔ جب کوئی مسلمان **لا الہ الا اللہ** کہتا ہے تو آن واحد میں وہ ایمان اور کفر دونوں کا اظہار کرتا ہے۔ یعنی اللہ پر ایمان اور غیر اللہ سے کفر۔

آیت الکرسی میں آتا ہے:

"**لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ**" (بقرہ / ۲۵۶)

یعنی دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا۔

اب حقیقت واضح ہو چکی کہ کس طرح کا جبر و اکراہ نہیں ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ طاغوت (یعنی جو کوئی بھی مظہر سرکشی ہے) کا کفر اختیار کرتا ہو وہ نجات یافتہ ہے اور اس نے **عروۃ الوثقیٰ** یعنی مضبوط رسی کو تھام لیا ہے۔

اسلام میں عملاً کفر کے بغیر ایمان قرار نہیں پاتا یعنی ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ سرکشی کے مظاہر کا انکار کرنا چاہیے تاکہ ایمان مکمل ہو جائے۔

جمع کا صیغہ

توحید عملی اور انسان کے وجود کے اس مرحلہ میں دلچسپ نکتہ یہ پایا جاتا ہے کہ نعبد جمع کا صیغہ ہے۔ اسے مفرد کی صورت میں یعنی اعبد نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ "میں صرف تیری ہی عبادت کرتا ہوں" بلکہ کہا گیا ہے کہ "ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں۔" اس مقام پر جو کہ انسان سازی کا مقام ہے' دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح انسان اللہ کی معرفت اور اس کی یاد میں رہنے کے پرتو میں خود سازی کے مرحلہ کو طے کر سکتا ہے اس سے غافل اور بے خبر رہنے کی صورت میں نہیں بلکہ ایسے ہی جیسے وہ عمل و فعالیت کے ساتھ اس مرحلہ کو طے کر سکتا ہے خالی فکر و نظر سے نہیں اسی طرح اجتماعی عمل و توحیدی معاشرے کے ہمراہ اور ہم آہنگ ہونے کے ذریعہ اس کی تربیت ہوتی ہے اہل توحید کے قافلے سے کٹ کر نہیں۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو غور و فکر کرتا' اللہ کو مانتا' اعمال دین اور معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے۔ لہٰذا فکر و معرفت کے بغیر انسان حقیقی انسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے کٹا ہوا اور اس سے غافل انسان حقیقت میں انسان نہیں ہے۔ اللہ کا قائل مگر عمل سے دور رہنے والا انسان بھی حقیقی انسان نہیں ہے بلکہ وہ ایک ناقص انسان ہے۔ اسی طرح اللہ کی معرفت رکھنے والا' غور و فکر کرنے اور عمل کرنے والا وہ انسان بھی ناقص ہے جو توحیدی معاشرے سے خود کو الگ تھلگ کیے ہوئے ہو۔ پس حقیقت میں "ایاک نعبد" کے معنی یہ ہیں کہ بار الٰہا ہم توحیدی معاشرے کے لوگ سب مل کر' ہم آہنگ ہو کر اور تیرے حکم پر کان دھرتے ہوئے تیری جانب آ رہے ہیں۔

ایاک نستعین

ہم صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں تیرے علاوہ کسی اور سے مدد طلب نہیں کرتے' نہ کمک چاہتے ہیں۔

یہ جملہ توحید در استعانت کا پتہ دیتا ہے۔ توحید در استعانت کے معنی فقط اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا صرف اسی پر بھروسہ کرنا اور اسی پر اعتماد کرنا ہیں۔ ممکن ہے یہاں ایک سوال اٹھایا جائے بلکہ اس سوال کو دو طرح اٹھایا جا سکتا ہے ایک مدد

طلب کرنے اور کمک چاہنے کے اصول کے نقطہ نظر سے۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین اور علمائے اخلاق کا کہنا ہے کہ انسان کو اعتماد بالنفس ہونا چاہیے۔ دوسرے پر اعتماد کرنا یا دوسرے سے مدد طلب کرنا انسان کو غیر پر بھروسہ کرنے والا اور کمزور و ضعیف بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس اعتماد بالنفس انسان کی قوت و توانائی کو بیدار و زندہ کرتا ہے۔

اس اصول کے مطابق انسان کو اپنے آپ پر اعتماد ہونا چاہیے کسی دوسرے پر نہیں وہ دوسرا خدا ہو یا غیر خدا ہو۔ اس لیے عہد حاضر کے دانشمند "توکل" کو جو اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنے کا نام ہے' اعتماد بالنفس کے ختم ہونے کا موجب جانتے ہے' اسے مسترد کرتے اور غیر اخلاقی امر قرار دیتے ہیں۔

اس سوال کو دوسری صورت میں بھی اٹھایا جا سکتا ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد کیوں نہیں طلب کرنی چاہیے۔ یہ بات تو عقل کے مطابق ہے کہ غیر خدا کی عبادت نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن اس کا کیا سبب کہ غیر خدا سے مدد بھی طلب نہ کی جائے؟ خداوند متعال نے دنیا کو عالم اسباب قرار دیا ہے۔ یہاں ایک انسان کو دوسرے انسان یا دوسری اشیا کا محتاج بنایا ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مجبوراً دوسرے انسانوں اور دیگر اشیا کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ اصل بات اور ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی مدد طلب کرنا اور اس پر اعتماد کرنا قبیح ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری مخلوقات کا نیاز اور ان سے الگ خلق فرمایا ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ اس طرح کا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسرے سے غرض رکھتا ہے۔ اسلام میں باہمی تعاون کے امر کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

تعاونوا علی البر و التقوی (مائدہ / ۲)

یعنی نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ تعاون کا مادہ "عون"

ہے۔ اگر غیر خدا سے مدد طلب کرنا بالکل جائز نہ ہوتا تو پروردگار عالم تعاون کا حکم نہ دیتا بلکہ وہ تو بتلا رہا ہے کہ تم ایک دوسرے کے محتاج ہو' لہذا تمہیں آپس میں ایک دوسرے کی مدد و نصرت کرنی چاہیے۔

ایک شخص نے جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے سامنے ان الفاظ کے ساتھ دعا کی "یا اللہ مجھے اپنی مخلوق کا محتاج نہ فرما"۔

آپؑ نے فرمایا: "آئندہ ایسا مت کہنا"۔ اس نے عرض کیا "پھر کیا کہوں"۔ آپؑ نے فرمایا: "کہو! اے خدا مجھے اپنی مخلوق کے برے لوگوں کا محتاج نہ کرنا"۔ مطلب یہ ہے کہ پہلا جملہ ایک امر غیر ممکن ہے کیونکہ انسان کو خلق ہی اس طور پر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی کی پیش رفت کے لیے دوسروں کا نیاز مند ہو۔ پس **"ایاک نستعین"** میں یہ نہیں کہا گیا کہ انسان کو کسی سے مدد طلب نہیں کرنی چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ اصل بات کیا ہوئی؟ پس اس آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انسان کا وہ آخری اور مکمل اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے یعنی انسان کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کامل کرنا چاہیے۔ جبکہ دنیا میں وہ جن سے بھی مدد طلب کرتا ہے ان کو فقط وسیلہ جانے بلکہ یہ ذہن نشین کر لے کہ خود انسان' اس کے قوائے جسم' اس کا زور بازو' اس کی ذہنی قوت یہ سب کے سب وہ وسائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خلق کر کے اس کے اختیار میں دیئے ہیں جن سب کا اختیار اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دنیا میں وسائل پر بہت زیادہ اعتبار کرتا ہے لیکن بعد میں کبھی کبھی اپنی توقع کے برعکس پاتا ہے کہ جس وسیلہ سے اس نے مدد لی تھی اس نے مطلوبہ کام انجام نہیں دیا جو اسے دینا چاہیے تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے قویٰ پر اعتماد کرتا ہے مگر وہ بھی بعض اوقات اس کی خواہش کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی کی واحد ذات ایسی ہے کہ اگر انسان اس پر بھروسہ کرے اور اپنے امور کو اس کی مشیت کے مطابق بنا دے پھر اس کے لیے کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔

تاریخ میں آتا ہے کہ ایک جنگ میں رسول اکرمؐ اپنے لشکر سے الگ ہو کر

لشکر گاہ کی حدود میں ہی واقع ایک ٹیلے پر آرام فرماتے ہوئے سو گئے۔ اتفاق سے دشمن کی فوج کا ایک شجاع و مسلح لشکری گشت کرتا ہوا ادھر آنکلا۔ اس کی نگاہ رسول اللہؐ پر پڑی تو آپ کو پہچان لیا اور بہت زیادہ خوش ہوا کہ اس نے چونکہ آپؐ کو اکیلا پا لیا ہے اس لیے اب آپؐ کو قتل کر ڈالے گا۔ ابھی رسول اللہؐ محو خواب تھے کہ وہ شخص آپؐ کے سرہانے آگیا اور چیخ کر بولا:

"محمد! کیا آپ ہیں؟" آنحضرتؐ نے اس کی جانب دیکھا اور فرمایا۔ "ہاں میں ہی ہوں"۔ وہ بولا "اب کون آپ کو مجھ سے بچا سکتا ہے؟" رسول اللہؐ نے فوراً فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ"۔

اسے یہ توقع نہیں تھی۔ کہنے لگا: "ابھی پتہ چل جائے گا۔" پس وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تاکہ پوری قوت کے ساتھ وار کر سکے۔ اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ بری طرح زمین پر گر گیا۔ آنحضرتؐ تیزی سے اٹھے' اس کے سرہانے جا کھڑے ہوئے اور فرمایا: "اب تجھے مجھ سے کون بچا سکتا ہے" اس شخص نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے کہا: "آپ کا کرم"! رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اسے معاف فرما دیا۔

الغرض مذکورہ آیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان دنیا میں کسی وسیلہ کی جانب مدد کے لیے ہاتھ نہ بڑھائے۔ بلکہ غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ اسے مسبب الاسباب کو بھی پہچاننا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ تمام وسیلوں اور اسباب کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

اهدنا الصراط المستقيم

یا اللہ! سیدھے راستے کی طرف ہماری راہنمائی فرما۔

صراطِ مستقیم کی وضاحت کے لیے چند مطالب کو بیان کرنا ضروری ہے۔

۱۔ تمام موجودات ایک تکوینی و غیر اختیاری سفر میں ہیں' جو کہ ناموس ہستی کا لازمہ ہے' خداوند متعال کی جانب گامزن ہیں۔ **"الا الی اللہ تصیر الامور"** (شوریٰ / ۵۳) یعنی یقیناً اسی کی طرف تمام امور کی بازگشت ہے۔ **"و ان**

الیٰ ربک المنتھیٰ" (نجم / ۴۲) اور بے شک سب کی آخری منزل پروردگار کی بارگاہ ہے۔

انسان بھی ایک موجود و مخلوق ہونے کی حیثیت سے اسی اصول کے تابع ہے۔

"یا ایھا الانسان انک کادح الیٰ ربک کدحا فملاقیہ"

(انشقاق / ٦)

یعنی اے انسان! تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پس ایک دن تو اس سے ملاقات کرے گا۔

۲۔ مختلف راستوں میں صرف ایک ہی راستہ ہے جو صراط مستقیم ہے۔ سعادت کا راستہ اور اختیاری راستہ وہ راستہ ہے جو انسان کو منتخب کرنا چاہیے۔

۳۔ چونکہ انسان جس چیز کو منتخب کرتا ہے وہ ایک طرح کا راستہ ہے۔ لہٰذا منزل تک پہنچنے کے لیے وہ سفر کی نوعیت کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے کمال کی جانب بڑھنا چاہتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان منازل تکمیل میں رہنے والی ایک مخلوق ہے۔ لہٰذا **"اھدنا الصراط المستقیم"** کے معنی یہ ہوئے کہ پروردگارا تکامل ہستی کے لیے راہ راست کی جانب میری راہنمائی فرما۔

۴۔ تکامل کے راستے کو ڈھونڈا جاتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ اس کے برعکس نظریہ وجودیت کے اعتبار سے کوئی راستہ اور کوئی منزل وجود نہیں رکھتی اور انسان خود اپنی منزل و اہمیت پیدا کرتا ہے۔ راستہ بناتا ہے انسان منزل' راہ اور کمال خود بناتا ہے۔ اس طرح کمال کو کمال اور اپنی اقدار کو اقدار بنانے والا انسان خود ہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ منزل' راہ' کمال منزل اور وجود اقدار ہستی کی آفرینش اور خلقت کے متن میں تعین پا چکے ہیں۔ اب انسان کو خود اسے تلاش کرنا' منزل کو ڈھونڈنا اور راہ کو طے کرنا ہے۔

۵۔ صراط مستقیم وہ راستہ ہے شروع سے ہی جس کی سمت معین ہے۔ اس کے برعکس غیر مستقیم یعنی منحنی راستے جو انسان کو آخر کار منزل تک تو پہنچا دیتے ہیں لیکن بار بار سمت بدلنا پڑتی ہے۔ پس کمال کی جانب انسان کا راستہ اضداد میں

سے گزرنے کی قسم سے نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر منطقی حضرات کہتے ہیں۔

۶۔ یہ بات کہ تکامل کا راستہ ڈھونڈا جاتا ہے ایجاد نہیں کیا جاتا' تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تکامل کا راستہ مکانی راستوں کی مانند راہ چلنے والوں کے ذریعہ خارج میں بنایا جا چکا ہے اور انسان کو اس پر گامزن ہونا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ چلنے والے کے وجود میں اس کے کمال حقیقی کی طرف' جو بارگاہ حق تعالیٰ تک پہنچنے سے عبارت ہے' جانے والا راستہ موجود ہے۔ یعنی کمال حقیقی تک پہنچنے کے لیے انسان میں کاملاً" فطری استعداد اسی طرح پائی جاتی ہے جس طرح کھجور کی گٹھلی میں درخت بننے کی استعداد ہوتی ہے۔

۷۔ انسان اپنی فطری استعداد کے باوجود راہبر و ہادی کا محتاج ہے۔ کیونکہ انسان اور اپنے اپنے کمالات تک پہنچنے کی صلاحیت رکھنے والی دیگر تمام مخلوقات کے درمیان ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے جو یہ کہ دیگر تمام مخلوقات کا راستہ فطرتاً" معین کر دیا گیا ہے یعنی ہر مخلوق کا فقط ایک ہی طریق کار ہے جبکہ انسان ایسا نہیں۔ اسے جدید فلسفہ میں اس طرح کہا جاتا ہے۔

"ہر موجود طبیعت کا حامل ہے مگر انسان طبیعت سے خالی ہے۔"

ماہرین وجودیت اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسان ایک بے ماہیت و بے طبیعت مخلوق ہے۔ لیکن ہم مناسب مقام پر اس بات پر تفصیل سے بحث کر چکے ہیں اور ہم نے ثابت کیا ہے کہ ان حضرات کا نظریہ صحیح نہیں۔ انسان در حقیقت متضاد و مختلف طبائع کا مالک ہے۔ اسے علوی و سفلی طبیعتوں میں سے اپنا راستہ منتخب کرنا ہوتا ہے جبکہ دیگر حیوانات کو اپنا راستہ خود منتخب نہیں کرنا ہوتا۔

بلکہ گھوڑے' گوسفند' بلی اور کتے وغیرہ کو ایسی جبلی خواہشات کے ساتھ خلق کیا گیا ہے جن کے ساتھ ان کا طریق عمل بھی متعین ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی پوری تاریخ میں ان سب کی خاص خصائل و عادات ہوتی ہیں جن کے مطابق سب کا ایک ہی جیسا رویہ ہوتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اور چیونٹیاں گھر بنانے اور خوراک جمع کرنے کے حوالے سے ایک جیسی ہیں' ان کے کام میں کبھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی لیکن انسان کے سامنے سینکڑوں راستے رکھے گئے ہیں جن میں سے وہ کسی

ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔

سورۂ والليل میں ارشاد ہوتا ہے:

"ان سعیکم لشتی" (لیل / ۴) (بے شک تمہاری مساعی مختلف قسم کی ہیں) اے بنی آدم تیری کوششیں مختلف النوع ہیں۔ یہ بات انسان کے کمال کی مظہر ہے' اس کی کمزوری کی نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم کہیں کہ انسان بالکل بے راہ ہے۔

مادہ پرست خصوصاً ماہرین وجودیت یہ سمجھتے ہیں لیکن قرآن اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن صرف یہ فرماتا ہے کہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان سے اس کے خالق تک جاتا ہے اور یہ معین راستہ ہی انسان کا تکامل کہلاتا ہے۔ انسان کے سامنے ہزاروں راستے ہیں جن میں سے صرف ایک ہی صراط مستقیم ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب جاتا اور اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ اب انسان مختار ہے کہ ان راستوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے۔ اگر اسی راستے کو منتخب کرے تو ٹھیک ورنہ اس کے علاوہ باقی تمام راستے بالکل نادرست و غلط ہیں۔ یہی معنی ہیں اس معروف حدیث کے کہ ایک روز رسول اکرمؐ ایک جگہ تشریف فرما تھے۔ چند افراد آنحضرتؐ کے حضور حاضر تھے۔ آپؐ نے زمین پر چند لکیریں کھینچیں ان میں سے ایک لکیر سیدھی اور باقی سب ٹیڑھی تھیں۔ پھر فرمایا۔

"یہ ایک راستہ میرا ہے۔ باقی کوئی راستہ میرا نہیں۔"

قرآن مجید میں ظلمت کا ہمیشہ جمع کے طور پر اور نور کا مفرد کی صورت میں ذکر ہونے کا راز بھی یہی ہے۔ **"اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمات الی النور"** (بقرہ / ۲۵۷) یعنی اللہ صاحبان ایمان کا ولی ہے وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔

گمراہی کے گوناگوں راستے ہیں مگر حق کا فقط ایک ہی راستہ ہے۔ یہیں سے انبیا کی جانب سے ہدایت کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ سیدھا راستہ جو انسان کو کمال کے آخری درجہ تک پہنچاتا ہے۔ اسے انسان انبیا کی رہنمائی کے بغیر

نہیں پہچان سکتا بلکہ ضروری ہے کہ اللہ کے فرستادہ اس کی راہنمائی فرمائیں۔

اس سلسلہ میں تفسیر المیزان میں ایک نکتہ کی تشریح ہوئی ہے۔ قرآن مجید میں لفظ "سبیل" بھی "راستہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر اس کے معنی "صراط" سے مختلف ہیں۔ یہ لفظ یعنی سبیل' بعض مقامات پر جمع کی صورت میں استعمال ہوا ہے جبکہ "صراط" کا لفظ ہر جگہ بصورت مفرد آیا ہے۔ سبیل کے معنی ان ذیلی راستوں کے ہیں جو اصلی راستے سے آن ملتے ہیں جبکہ صراط کے معنی ایک ہی حقیقی راستے کے ہیں۔

ممکن ہے کہ کسی مقام تک پہنچنے کے لیے ایک سے زیادہ راستے نہ ہوں لیکن آس پاس سے آنے والے ذیلی راستے متعدد ہوں اور آخر کار وہ سب راستے اسی اصلی راستے پر آکر ختم ہوں۔

ہم سب انسان ایسے کاروان کی مانند ہیں جو کمال کے راستے پر چل رہا ہے۔ انتہائے کمال تک پہنچنے کے لیے ہمیں صحیح راستے سے گزرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر کوئی کسی ایک ذیلی راستے سے اس اصلی راستے تک پہنچ جائے۔ اگر ہر کوئی اپنے اپنے مقام و منصب پر اپنا انسانی' اخلاقی اور شرعی فرض ادا کرے تو حقیقت میں اس نے ایسا راستہ منتخب کرلیا جو آخر کار اسے اصلی راستے تک پہنچا دیتا ہے اگرچہ شروع میں سب راستے ایک دوسرے سے متضاد ہی ہوں۔ مثلاً ممکن ہے کہ ایک طبیب' مزدور' تاجر وغیرہ یہ سب ایسے راستے پر ہوں جن کو طے کرکے انسان اپنے آپ کو صراط مستقیم کے نزدیک لے جائے۔

صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین

مقام بندگی کے اعتبار سے انسان کو کیا حاصل کرنا چاہیے اور کس راستے کا انتخاب کرنا چاہیے؟ لوگوں کی تین اقسام ہیں:

پہلا گروہ

ان لوگوں کا ہے جو عبودیت کا راستہ طے کرتے ہیں اور جیسا کہ ہم لفظ

الرحیم کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں پروردگار عالم کی خاص رحمت ان لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمات مسلسل ان تک پہنچتی رہتی ہیں۔ گویا وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک غیبی ہاتھ ان کی پشت پر ہے۔ یہی لوگ مقربان بارگاہ الٰہی ہیں۔ ان میں پہلا مرتبہ انبیا و اولیا اور ان کے بعد کامل انسانوں کا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ انہیں اپنا پیشوا قرار دے اور ان کی ہر طرح پیروی کرے۔ زیر بحث آیت کے پہلے جملے میں انسان اللہ تعالیٰ سے انہی کے راستہ کی درخواست کر رہا ہے۔

دوسرا گروہ

دوسرا گروہ پہلے گروہ کے برعکس ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بجائے غیر خدا کی پرستش کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے ہیں۔ ان کے اعمال کے اثرات یکے بعد دیگرے ان کے وجود میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی قوت برابر انہیں راہ راست سے دور کئے جا رہی ہے۔ یہ لوگ پہلے طبقے کی طرح خداوند تعالیٰ کی طرف بلند ہونے اور پروردگار عالم کے پے در پے انعام سے سرفراز ہونے کی بجائے اس کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں یہ کمال کے راستہ سے مکمل طور پر محروم ہو جاتے ہیں اور بدبختی کے خوفناک گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ومن یحلل علیه غضبی فقد هوٰی" (طٰہ / ۸۱)

یعنی جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ یقیناً برباد ہوا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو انسانیت کے راستہ کی بجائے حیوانی راستوں پر چلتے ہیں۔ ان کی انسانیت مسخ ہو چکی ہے۔ یہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف جاتے ہیں۔ قرآن کریم ان کو **"المغضوب علیهم"** کے نام سے یاد کرتا ہے۔

تیسرا گروہ

ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"مذبذبین بین ذالک لا الیٰ هؤلاء و لا الیٰ هؤلاء" (نساء / ۱۴۳)

یعنی یہ کفر و اسلام کے مابین حیران و سرگردان ہیں' نہ کفر کی طرف ہیں اور نہ اسلام کی طرف۔

ان لوگوں کے سامنے کوئی معین راستہ نہیں ہے۔ یہ حیران و پریشان ہیں' ہر لمحہ ایک نئے راستے پر چلتے ہیں اور کبھی بھی منزل پر نہیں پہنچتے۔ قرآن کریم ان کو "**الضالین**" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

ہم جو کہتے ہیں "**اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین**" تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنا سیدھا راستہ دکھا۔ وہ راستہ جو تیرے اولیا اور تیری بارگاہ کے راست و پاک لوگوں کا ہے' ایسے لوگ تیری نعمتیں پے در پے جن کے شامل حال ہوتی ہیں' ان لوگوں کا راستہ نہیں جو مسخ ہو چکے اور انسانیت سے دور ہو چکے ہیں جن پر تیرا غضب ہوتا ہے' ان لوگوں کا راستہ نہیں جو حیران و سرگرداں ہیں اور ہر لمحہ نئی شکل اپنا کر دوسرے گروہ سے جا ملتے ہیں۔

(سورۂ حمد اختتام کو پہنچا)

maablib.org

سورۃ بقرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الم ○ ذلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین ○ الذین یومنون بالغیب و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقنا ھم ینفقون ○ والذین یومنون و بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالاخرۃ ھم یوقنون ○ اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم و اولٰئک ھم المفلحون ○ ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون ○ ختم اللہ علیٰ قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ ولھم عذاب عظیم ○

(شروع کرتا ہوں) اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

الم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صاحبان تقویٰ کے لیے مجسم ہدایت ہے۔ جو غیب پر (جو احساس سے پوشیدہ و مخفی ہے) ایمان رکھتے ہیں' پابندی سے پورے اہتمام کے ساتھ نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق انہیں دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ وہ ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں (اے رسولؐ) ہم نے آپ پر نازل فرمایا ہے اور جو آپ سے پہلے (انبیائے ماسلف پر) نازل کی گئیں اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت یافتہ اور فلاح یافتہ و کامیاب ہیں۔ اے رسول جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں' یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اللہ

نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے (یعنی یہ نہ کچھ سنتے ہیں نہ کچھ سمجھتے ہیں) ان کی آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں اور ان کے واسطے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

سورہ کی وجہ تسمیہ

یہ سورہ قرآن مجید کا طویل ترین سورہ ہے اور تقریباً اڑھائی پاروں پر مشتمل ہے اس کو "بقرہ" ۱۰ کا نام دیا گیا ہے' کیونکہ اس میں بنی اسرائیل کی گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

حروف مقطعات

یہ مدنی سورتوں میں سے ایک ہے اور قرآن مجید کے تیرہ دیگر سورتوں کی طرح اس کا آغاز بھی حروف مقطعات سے ہوا ہے۔ حروف مقطعات سے مراد ایسے حروف تہجی ہیں جو آپس میں مرکب نہ ہوں۔ ان سورتوں میں بعض کا آغاز ایک حرف سے ہوتا ہے مثلاً **ن والقلم** یا **ق**' بعض کا دو حروف سے مثلاً **یس**' **طہ**' **طس**' بعض کا تین حروف سے مثلاً **طسم**' **الم**' بعض کا چار حروف سے مثلاً **المص** اور بعض کا پانچ حروف سے مثلاً **حمعسق** اور **کھیعص**۔

حروف مقطعات قرآن مجید کی امتیازی خصوصیت کے حامل ہیں۔ دوسری کوئی کتاب' چاہے وہ آسمانی ہو یا غیر آسمانی ایسی نہیں ہے جس کی فصول کا آغاز حروف مقطع کے ساتھ ہوا ہو۔

سوال یہ ہے کہ ان حروف کا مطلب کیا ہے؟ یہ سوال صدر اسلام سے ہی اٹھتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے نظریات کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک کوئی قطعی رائے سامنے نہیں آئی ہے۔ ہم یہاں ان نظریات میں سے بعض کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

بعض لوگ معتقد ہیں کہ یہ متکلم و مخاطب یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہؐ کے درمیان رموز و اسرار کا ایک سلسلہ ہے۔ یعنی یہ ایسے مطالب و معارف ہیں جو عام لوگوں کی فکری سطح سے بلند تر ہیں اور چونکہ لوگ انہیں سننے کی استعداد نہیں

رکھتے اس لیے ان مطالب کو صراحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ اشارہ و کنایہ کی صورت میں ادا کیے گئے ہیں۔ یہ بات اکثر دو عام انسانوں کی گفتگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب کوئی شخص نہیں چاہتا کہ سب لوگ اس کی بات سے آگاہ ہوں تو وہ اپنا مافی الضمیر اشاروں میں مخاطب تک پہنچاتا ہے۔

دوسری رائے یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ قرآن مجید کے مختلف اسما ہیں یا ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں' مثلاً سورۂ بقرہ کا نام جس کا آغاز الم سے ہوتا ہے' الم ہی ہے اور سورۂ طه کا نام طه ہے۔

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ یہ قسمیں ہیں۔ قرآن مجید نے جس طرح خلقت کے دوسرے مظاہر یعنی سورج' چاند' ستاروں' دن' رات' انسانی نفس وغیرہ کی قسم کھائی ہے اسی طرح حروف تہجی کی بھی قسم کھائی ہے۔ پس الم کے معنی ہیں "الم کی قسم ہے"

انسان جب کسی چیز کی قسم کھاتا ہے تو درحقیقت وہ اس چیز کو اپنے کلام کی صداقت کا ضامن قرار دیتا ہے جو اس کے نزدیک قابل احترام ہوتی ہے اور مخاطب بھی جانتا ہے کہ وہ چیز قسم کھانے والے کو عزیز ہے اور وہ کسی صورت میں اس چیز کی ہتک و خواری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب کا کہنا ہے کہ قسم سخن حق کی صداقت کی تاکید و تائید کرتی ہے لیکن بعض اوقات انسان اس مقصد کے لیے قسم نہیں کھاتا بلکہ اس حقیقت کے لیے قسم کھاتا ہے جو قسم کا لازمہ ہے' یعنی اس لیے قسم کھاتا ہے کہ مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ متکلم کے نزدیک وہ چیز محترم ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص دوسروں کو یہ بتانا چاہے کہ وہ فلاں کو محترم جانتا ہے تو اس کے سر اور اس کی جان کی قسم کھاتا ہے۔ اس طرح کی قسم میں اصل مقصد مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی گئی) سے ہوتا ہے' مقسم علیہ (جس بات کے بارے میں قسم کھائی گئی) نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کی قسموں کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔ قرآن کریم نے چاند' سورج' زیتون' انجیر' دن اور رات کی قسمیں کھا کر انسان کو ان کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے۔

انسانی تمدن و ثقافت میں جن چیزوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے ان میں حروف تہجی بھی شامل ہیں۔ الفاظ کی شکل اختیار کرنے والے ان حروف کا انسان کی معاشرتی زندگی میں نہایت اہم کردار ہے۔ حیوانات کی بھی آواز ہوتی ہے مگر وہ اس سے حروف نہیں بنا سکتے۔ اگر انسان بھی گونگوں کی مانند آواز کو حروف میں نہ ڈھال سکتا تو تکلم پر قادر نہ ہوتا اور اپنے مقاصد دوسروں سے بیان نہ کر سکتا' کوئی علم' تمدن اور صنعت وجود میں نہ آتی' حتیٰ کہ لکھائی اور خطوط نویسی جو کہ بذات خود بہت بڑی نعمت ہیں' قرآن کریم نے ان کے مناسب حال مقامات پر ان کی بھی قسم کھائی ہے! تکلم کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ مثلاً یہ جو ہم الف' لام' دال' جیم کو جدا جدا لکھ سکتے ہیں تو یہ اس لیے ہے کہ ہم جداگانہ طور پر ان کا تلفظ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ حروف نہ ہوتے تو ہمیں اپنے مقاصد و مطالب بیان کرنے کے لیے ان کی تصویریں بنانا پڑتیں' مثلاً گھر کو بیان کرنے کے لیے گھر کی تصویر اور گاڑی کے ذکر کے لیے اس کی تصویر بنانا پڑتی۔ ظاہر ہے کہ ہر چیز کی شکل تو نہیں ہوتی کہ اس کی تصویر بنا کر اس کو بیان کیا جا سکے۔

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ یہ حروف قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہیں' یعنی عربی زبان میں حروف تہجی کی تعداد اٹھائیس ہے۔ بعض زبانوں میں ان کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ بعض زبانوں میں تقریباً تین سو تک حروف تہجی ہیں۔ بہرحال حروف تہجی جو کلام کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں' سب کی دسترس میں ہیں۔ لیکن کیا سب لوگ ان کے ذریعہ عمدہ کلام کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ حروف بالکل اس تارو پود کی مانند ہیں جو سب کپڑا بنانے والوں کے پاس ہوتے ہیں لیکن کیا فنی اعتبار سے سب بننے والے ایک ہی جیسا بنتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

سخنوری کی قوت اور اس کے جوہر انہی حروف کی ترکیب سے وجود میں آتے ہیں۔ کتابیں' مقالے' قصائد اور غزلیں سب انہی حروف سے وجود میں آتی ہیں حالانکہ درجات اور مراتب کے اعتبار سے ان میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

ہم چند آیات مبارکہ کے بعد پڑھیں گے کہ قرآن مجید نے اعلان فرمایا یعنی لوگوں کو مقابلہ کی دعوت دے کر فرمایا کہ تم تمام قادر الکلام افراد کو اکٹھا کر کے دیکھ لو کہ کیا تم قرآن کی مثال لا سکتے ہو؟

قرآن کریم حروف تہجی کے نمونوں کے طور پر ان حروف کا ذکر کر کے حقیقت میں آیات قرآنی کے خام مال کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہنا چاہتا ہے کہ اے لوگو! قرآن کسی دوسرے مواد سے تیار نہیں کیا گیا کہ تم یہ کہہ سکو کہ اگر وہ مواد تمہارے پاس بھی ہوتا تو تم بھی قرآن کی نظیر تیار کر لیتے۔ یہ حروف ہی ہیں جن کی تالیف و ترکیب ظاہر و واضح طور پر کی گئی ہے۔ تم بھی ان حروف سے قرآن جیسی کتاب تیار کر کے دکھاؤ۔

یہ حروف کسی کارخانہ کی پیداوار نہیں ہیں کہ تم کہہ سکو کہ اس کے آلات و وسائل تمہاری دسترس میں نہیں ہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے آلات و وسائل اور خام مال بھی تم لوگوں کی دسترس میں ہیں۔ یہ بات بجائے خود قرآن کریم کے عظیم معجزہ ہونے کو بیان کرتی ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا' کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا' ایسا منظم کلام وجود میں لے آئے کہ کوئی بھی اس کی مثال پیش کرنے پر قادر نہ ہو۔

قرآن کریم کے حروف مقطعات کے حوالہ سے چند سال قبل ایک اور بات بھی سامنے آئی ہے جس کا بہت چرچا ہوا اور اخبارات نے اسے تحریر کیا۔ وہ بات یہ تھی کہ کمپیوٹر کے ایک مصری ماہر نے قرآن کریم کی ان چودہ سورتوں کی گہری تحقیق کی جن کے آغاز میں یہ حروف آتے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سورتوں میں سے ہر سورہ میں دوسرے تمام حروف کی نسبت ان حروف مقطعات کا کردار زیادہ اہم ہے جو اس کے آغاز میں بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً سورہ بقرہ کی ساخت میں الف' لام' میم کا کردار دیگر حروف کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ یہ تناسب اس قدر دقیق ہے کہ انسانی دماغ اس کا حساب نہیں لگا سکتا کیونکہ بعض اوقات ایسی ایسی کسریں نکالنا پڑتی ہیں جن کا حساب کمپیوٹر کے بغیر لگانا ممکن ہی نہیں۔

بحث کے اختتام پر میں ایک اور احتمال بیان کرنا چاہتا ہوں' وہ یہ کہ عہد

قدیم سے اب تک یہ بحث چلی آرہی ہے کہ نظام ہستی میں سب سے پہلے کیا تھا؟ یعنی مقدم کیا ہے اور موخر کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں مجموعی طور پر دو نظریات بیان ہوئے ہیں بعض کا نظریہ ہے کہ سب سے پہلے کلمہ و سخن بنے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ پہلے فکر، فہم اور ادراک تھا کیونکہ سخن فکر کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے بعد مادہ پیدا ہوا۔

دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو تقدیم مادہ کے قائل ہیں یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مادہ اور طبیعیات کا وجود پیدا ہوا اور مادہ کے تدریجی تکامل کے بعد فہم، شعور اور ادراک کو وجود ملا پھر اس کے بعد گفتگو بنی۔

ان دو نظریات میں سے قرآن نے گویا پہلا نظریہ قبول فرمایا ہے کیونکہ وہ تخلیق کے مسئلے کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔

"انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون" (یٰسین / ۸۲)

یعنی اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں ارادہ فرما کر کہتا ہے ہو جا اور وہ شے ہو جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے سخن و کلام ہوا اس کے بعد باقی مخلوقات۔ ظاہر ہے کہ آیت میں لفظ "قول" فقط ایک لفظ ہوا اور آواز کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اس سے زیادہ جامع و کامل ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف مقطعات کے ساتھ اپنے کلام کے آغاز کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ مطلب یہ کہ قول، سخن اور فکر کو مادہ، جسم اور طبیعت پر تقدم حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی حروف مقطعات قرآن کریم کے متشابہات میں سے ہیں، بالخصوص اگر ہم پہلے نظریہ کو صحیح تسلیم کر کے کہیں کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ اور پیغمبر اسلامؐ کے مابین رموز کا درجہ رکھتے ہیں۔

ذالک الکتاب لاریب فیہ

وہ کتاب! غور فرمائیں یہ نہیں فرمایا کہ "یہ کتاب" بلکہ فرمایا ہے "وہ کتاب" یہ مقام تعظیم ہے۔ عربی زبان میں جب کسی چیز کی تعظیم مقصود ہو تو دور کی

ضمیر استعمال کی جاتی ہے' مطلب یہ کہ وہ چیز ہم سے اور آپ سے بھی بہت زیادہ فاصلہ پر ہے۔

لاریب فیہ اس میں کوئی شک نہیں ہے! کیا مطلب؟ کس طرح کا شک قرآن میں نہیں؟ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ فی الواقع بعض لوگوں کو قرآن کی اصالت و حقیقت میں شک ہے بلکہ قرآن خود اسی سورہ میں فرما رہا ہے۔

"و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ"

(بقرہ / ۲۳)

یعنی اگر تمہیں اس کلام میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو اس جیسا ایک سورہ ہی لے آؤ۔

اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہے تو قرآن جیسا ایک ہی سورہ بنا لاؤ۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تمہیں شک نہیں ہے۔

جواباً" ہمیں کہنا ہوگا کہ جب آپ لوگ ایسی کتاب دیکھتے ہیں جس میں واقعات تحریر کیے گئے ہوں تو اس کے مطالعہ کے بعد آپ سوچیں گے کہ کیا یہ واقعات صحیح ہیں یا حقیقت پر مبنی نہیں ہیں؟ لہذا آپ اس میں متردد ہوتے اور شک بھی کرتے ہیں۔

ان کے سچے یا جھوٹے ہونے سے باخبر ہونے کے لیے آپ کو اس سے متعلق ماخذ کی طرف رجوع اور ان میں تحقیق کرنا ہوگی۔ اس قسم کی کتابوں میں یہی ہوتا ہے۔ خبروں' اطلاعات اور دعووں کے حوالہ سے تو یہی ہے کہ ان کی صداقت کے اثبات کے لیے دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات مطالب اس طرح انسان پر ثابت ہو جاتے ہیں گویا وہ انہیں چھو رہا ہو یا محسوس کر رہا ہو۔ اس صورت میں کسی شاہد یا دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً ایک ایسا شخص ہے جس کو آپ نہیں جانتے' نہ ہی آپ نے کبھی اس کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے' اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وہ عادل ہے تو آپ شک کر سکتے ہیں۔ اس کے اثبات کے لیے آپ کو دلیل و شاہد کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اس طرح کہ اگر دو ایسے عادل افراد جن کی عدالت کے آپ معترف ہوں' اس کے عادل

ہونے کی گواہی دیں تو آپ تسلیم کر لیتے ہیں ورنہ آپ اسے عادل تسلیم نہیں کریں گے۔

لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو جس کو آپ قریب سے جانتے ہوں' اس سے مانوس ہوں' سفر و حضر میں اس کے کردار و رفتار کو دیکھ چکے ہوں' اس طرح اس کا تقویٰ و عدالت آپ کے نزدیک ثابت ہو چکی ہو تو کیا پھر بھی کسی دلیل اور گواہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

علمی و نظریاتی مسائل میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ بعض اوقات بعض مسائل کے اثبات کے لیے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ بعض مسائل میں اگر اصل مسئلہ انسان پر واضح ہو جائے تو پھر اس کو ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اس کا بیان کیا جانا ہی اس کے ثابت ہو جانے کے برابر ہوتا ہے۔ قرآن بھی اسی طرح ہے۔ ممکن ہے کسی کو قرآن کی اصالت میں شک ہو لیکن یہ شک اس وقت تک ہوگا جب تک وہ قرآن سے دور رہے گا۔ جونہی وہ قرآن کے نزدیک ہوگا اس کا شک دور ہو جائے گا۔ البتہ یاد رہے کہ قرآن کے قریب ہونا دو طرح سے ہوتا ہے! ایک یہ کہ انسان قرآن کو پڑھے' اسے سمجھے اور اس کی آیات کی تفسیر کی جانب رجوع کرے! دوسرا یہ کہ اس پر عمل کرے۔

چونکہ قرآن خالصتاً" ایک نظریاتی کتاب نہیں' اس میں عمل و نظر ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ اے لوگو تم قرآن میں شک کرتے ہو' شک کرنے کا تمہیں حق بھی حاصل ہے کیونکہ نہ تو تم نے قرآن میں غور کیا ہے' نہ اس کا نزدیک سے مطالعہ کیا ہے اور نہ عملی طور پر اس کو آزمایا ہے تو اگر تم اس کے قریب ہو جاؤ' اسے چھو کر دیکھو تو پھر تمہیں اس کی اصالت میں کوئی شک باقی نہیں رہے گا۔

هدی للمتقین

قرآن کی معرفت نیز اس کے قریب ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز جو ضروری ہے وہ یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کیوں نازل ہوا اور اس کی ماہیت کیا ہے

تاکہ ہم اس کی اصالت اور اس کے بارے میں شک و تردید کا شکار نہ ہوں! کیونکہ جس کتاب کے متعلق انسان جانتا ہی نہ ہو کہ وہ کس مقصد کے تحت لکھی گئی ہے اور اس کا ہدف کیا ہے' وہ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کیسی کتاب ہے' کس مقصد کے پیش نظر آئی ہے' کیا یہ طب کی کتاب ہے' فلسفہ ہے' تاریخ ہے یا ریاضی ہے؟ اگر ان میں سے کسی علم کے متعلق نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے؟ یہ ہدایت کی کتاب ہے' جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے **"هدی"**۔

اب سوال پیدا ہوگا کہ یہ کتاب کن لوگوں کی ہدایت کرتی ہے۔ کیا یہ سب کی ہدایت کرتی ہے؟ یعنی کیا قرآن کے آجانے کے بعد کوئی گمراہ باقی نہیں رہا اور سب کے سب جبری طور پر ہدایت پالیتے ہیں؟ نہیں' ایسا نہیں! نہ صرف یہ کہ یہ کتاب سب کی راہنمائی نہیں کرتی بلکہ بعض لوگ اس کے ذریعہ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں' جیسا کہ اس سورہ کی آیت ۲۶ میں آتا ہے:

"یضل به کثیرا و یهدی به کثیرا"

یعنی اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ ایک بڑی جماعت کو گمراہ اور بہت سے لوگوں کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے: **"وما یضل به الا الفاسقین"** اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ صرف فاسقوں کو گمراہ کرتا ہے۔ فاسقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو انسانی فطرت کے راستہ سے ہٹ چکے ہوں۔۱۱

مولانا روم فرماتے ہیں کہ جب نکات بہت دقیق و لطیف ہوں تو وہ لائق اشخاص کو بلندی کی جانب لے جاتے ہیں اور نالائق افراد کو گمراہ کرتے ہیں۔

از خدا می خواہ تازیں نکتہ ھا
در نلغزی و رسی در منتہا

(اللہ تعالیٰ کے قریب ہو تاکہ ان نکات کو سمجھ کر ان کے اصلی معنی تک پہنچنے کا ادراک کر سکے)

پھر اس آیت مبارکہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زانکہ از قرآن بسی گمرہ شدند

زین رسن قومی درون چه شدند

(کیونکہ قرآن ہی سے بہت لوگ گمراہ ہوئے جبکہ اس کی مضبوط رسی کو پکڑ کر قومیں کیا بن گئیں۔)

لفظ "رسن" کے معنی رسی یا طناب کے ہیں۔ قرآن کریم ہی سے یہ لفظ لیا گیا ہے جہاں قرآن نے حبل اللہ کا ذکر کیا ہے یعنی قرآن اللہ کی رسی ہے۔

مر رسن را نیست جرمی ای عنود

چون ترا سودای سر بالا نبود

(یعنی اے بھٹکے ہوئے انسان رسی کا کوئی قصور نہیں اس کا تعلق تیرے ذہنی عقیدہ و ضرورت سے ہے۔)

اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کی رسی کے ذریعہ ایک گروہ کنویں میں اتر گیا حالانکہ رسی تو رسی ہی ہے اس کے ذریعہ اوپر بھی جایا جا سکتا ہے اور نیچے بھی۔ اس میں رسی کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

ھدی للمتقین

یہ کتاب پرہیزگاروں اور پاک لوگوں کی ہدایت کرتی ہے۔ اس مقام پر لفظ "متقین" سے مراد وہی لوگ ہیں جو اپنی اولین فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ ہم مناسب مقام پر اس مسئلے کو زیر بحث لائے ہیں اور آئندہ بھی لائیں گے کہ قرآن میں فطرت سے کیا مراد ہے۔ اجمالی طور پر قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ ہر انسان دنیا میں پاک و پاکیزہ آتا ہے۔ یعنی اس میں ذاتی طور پر تقویٰ کا ایک معیار موجود ہوتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ بتدریج معاشرہ میں آلودگیوں کی وجہ سے فطری راستے سے ہٹ جائے اور بالکل مسخ ہو جائے۔

اسی لئے قرآن اس مقام پر فرماتا ہے کہ اگر کوئی اپنی اصلی فطرت پر قائم رہے تو یہ کتاب اس کی منزل مقصود کی جانب راہنمائی کرتی ہے اور اس میں جو استعدادات و کمالات بالقوہ پائے جاتے ہیں ان کو فضیلت کے بلند مرحلہ تک پہنچا دیتی ہے۔

الذین یؤمنون بالغیب

قرآن کریم کی سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ وہ انسان کو غیب پر ایمان رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ غیب اور شہادت دونوں قرآن کریم کی اصطلاحات ہیں۔

کائنات کے بارے میں قرآن کریم کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے کہ عالم ہستی فقط وہی ہے جو ہماری محسوسات کی دسترس میں ہے بلکہ محسوسات تو کائنات کا ایک مختصر سا حصہ ہیں۔ جن کا بیشتر حصہ ایک بلند تر پس منظر میں ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں محسوس کو "شہادت" اور غیر محسوس کو "غیب" کا نام دیا گیا ہے۔

فلاسفہ جسے عالم فطرت کہتے ہیں یعنی درخت' پھول' سمندر' صحرا' کہکشاں' ستارے وغیرہ یعنی ہر وہ چیز جسے انسان دیکھتا ہے' سونگھتا ہے یا سنتا ہے الغرض جسے محسوس کرتا ہے' قرآنی تعبیر میں جس کا "مشاہدہ" کرتا ہے وہ سب "شہادت" کا حصہ ہیں۔

اگر کائنات صرف اسی حصہ میں منحصر ہوتی تو پھر انسان کا تخیل و شعور خاص طور پر محدود ہوتا کیونکہ جب وہ دیکھتا کہ انسان پیدا ہوتا ہے کچھ عرصہ اس دنیا میں رہتا ہے' اس کے بعد مرجاتا اور فنا ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتا کہ انسان بس یہی ہے لہٰذا اسے اس کے کی ابتدا و انجام سے کوئی سروکار نہ ہوتا اور اس کے ذہن میں یہ خیال تک نہ آتا کہ انسان کہاں سے آیا ہے اور اسے کہاں جانا ہے!

قرآن مجید کا ہدف یہ ہے کہ انسان کو اس تنگ نظری سے باہر نکالے' اس کو یہ شعور و ایمان عطا فرمائے کہ مشاہدہ کی صورت میں وہ جس چیز کو محسوس کرتا ہے وہ کائنات کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جس کے پس منظر میں عظیم و بیکراں بحر ہستی موجزن ہے۔

انسان کے لیے غیب کا سب سے بہتر نمونہ اس کا اپنا وجود ہے۔ ہم اپنے جسم و بدن کو محسوس کرتے ہیں' اپنے نفس سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں اور یہ دونوں چیزیں ہمارے اپنے لیے منزل شہود مہیا کرتی ہیں لیکن جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے ان کے نفوس ہمارے لیے منزل شہود پر نہیں ہیں بلکہ مقام غیب پر ہیں

کیونکہ اگر ہم کسی کے ساتھ طویل عرصے تک عمر بسر کریں تو ہم صرف اس کی آواز سن سکتے ہیں' اس کے رخسار کا رنگ دیکھ سکتے ہیں اس کے جسم کو چھو سکتے ہیں جبکہ اس کا نفس ہمیشہ ہم سے مخفی رہتا ہے۔ اگر ہم اس کے رازہائے قلبی سے آگاہ ہوتے ہیں تو یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ ہم سے باتیں کرتا ہے جس کے بغیر ہم براہ راست ہرگز اس کے دل کی کیفیات سے واقف نہیں ہو سکتے تھے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ جدید ترین نفسیات کا ادعا ہے کہ انسان کا ایک اور غیب بھی ہے جو خود اس سے بھی مخفی ہے۔ اس کو اس کی مخفی روح کہا جاتا ہے جس کا وہ ادراک نہیں رکھتا۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ہم ایک نفس ناطقہ رکھتے ہیں جس کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے' میں یہ محسوس کرتا ہوں' فلاں چیز کو دوست رکھتا ہوں' فلاں سے دشمنی رکھتا ہوں۔

اسی طرح ایک نفس مخفی بھی ہے جو ہمارے وجود کے ایک بڑے حصے کو تشکیل دیتا ہے۔ انسان کی حقیقت یہی ہے کہ اس کا بڑا حصہ غیب ہے اور اس کا بہت تھوڑا سا حصہ منزل شہود میں ہے۔

قرآن کریم یہ بات تمام کائنات کے بارے میں فرماتے ہوئے انسان کو ایک جدید تصور عطا کرتا ہے۔ ملائکہ' لوح محفوظ' عرش و کرسی وغیرہ جن کا تعلق اس کائنات کے غیب و باطن سے ہے' کا انکار صرف اس وجہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہمارے حواس کی دسترس سے باہر ہیں بلکہ ہمیں معتقد ہونا چاہیے کہ کائنات کا ایک غیب ہے ہمارے حواس جس کے احساس سے قاصر ہیں۔ صرف شہود کا حصہ ایسا ہے جو ہم پر ظاہر ہے۔

ویقمون الصلوٰۃ

قرآن کریم نے ایمان بالغیب کے بعد جو دوسرا اصول پیش کیا ہے وہ نماز کو قائم کرنا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے اصول یعنی بالغیب کا تعلق مسلمانوں کے فکری و اعتقادی نظام سے ہے جبکہ دوسرے اصول کا تعلق کردار سازی سے ہے اور تیسرا

اصول انفاق ہے جس کو ہم بعد میں زیر بحث لائیں گے اس کا تعلق معاشرتی تربیت سے ہے۔ اس سے ہمیں نماز کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ جیسا کہ آپ ملاحظہ کرتے ہیں نماز کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ ہر مکتب فکر نے اپنے پیروکاروں کی تربیت کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا ہوتا ہے اسی طرح اسلام نے بھی مسلمانوں کی تربیت کے لیے عبادات کو سرفہرست رکھا ہے۔ جن میں نماز کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ نہیں فرمایا کہ "نماز پڑھتے ہیں" بلکہ فرمایا ہے کہ "نماز قائم کرتے ہیں"

نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے میں فرق ہے۔ قرآن کریم میں جہاں نماز پڑھنے کو کہا گیا ہے وہاں اصولی طور پر مذمت کا پہلو نکلتا ہے یعنی ان مقامات پر ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی نماز قابل اعتراض ہے۔

اقامت نماز سے کیا مراد ہے؟

نماز قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ نماز کا حق ادا کیا جائے یعنی نماز کو ایک بے روح پیکر کی مانند نہ بجالایا جائے بلکہ نماز ایسی ہو جو فی الواقع بندہ کو اپنے خالق و پروردگار کی طرف متوجہ کرے۔ یہی معنی ہیں "ذکر اللہ" کے جس کی جانب سورۂ طٰہ کی آیت ۱۴ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ "**اقم الصلٰوۃ لذکری**" (میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔)

اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے معنی غیر خدا کو بالکل فراموش کر دینا ہے۔ اگر انسان تھوڑی دیر کے لیے ہی معبود حقیقی کے ساتھ راز و نیاز کرے' اس سے مدد طلب کرے' اس کی ثنا کرے' اس کے اللہ ہونے' رب ہونے' رحمٰن ہونے' رحیم ہونے' احد ہونے' صمد ہونے اور **لم یلد و لم یولد ولم یکن لہ کفوا احد** ہونے کی صفات کا اعادہ کرے تو اس کے نفس پر اس کا گہرا اثر ہو گا' اس کی روح ایسی بن جائے گی جیسی دین اسلام چاہتا ہے۔ عبادت کے بغیر ایسا ہونا ناممکن ہے۔

"و مما رزقنا ھم ینفقون"

انفاق کے کہتے ہیں؟ وہ لوگ انفاق کرتے ہیں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ

اپنے آپ کو تہی دست و نادار کر لیتے ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے) بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ذخیرہ شدہ مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انفاق ضائع کرنے کے معنی میں ہو یعنی نفق و فقر کا دور کرنا' یعنی یہ لوگ فقر و ناداری کو دور کرتے ہوں۔

انفاق دراصل معاشرہ کے ساتھ انسان کا رابطہ استوار کرنے کو کہتے ہیں۔ پس پہلا اصول یعنی ایمان بالغیب انسان کے نظریہ کائنات سے متعلق ہے اور دوسرا اصول یعنی نماز قائم کرنا غیب کے ساتھ انسان کے دائمی رابطے کے مقام سے متعلق ہے۔

کیا انفاق مال کے ساتھ مختص ہے؟

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم نے ان کا جو رزق مقرر کیا ہے اس میں سے وہ انفاق کرتے ہیں۔"

رزق کا مفہوم عام ہے۔ خود قرآن کریم میں بھی اس لفظ کا معنوی و مادی دونوں طرح کے رزق پر اطلاق کیا گیا ہے۔ دانائی و عقل بھی خداداد رزق ہے۔ جن لوگوں کو یہ رزق ملا ہے انھیں چاہیے کہ اس میں سے انفاق کریں اور دوسروں کو اس سے بہرہ مند کریں۔

فلسفہ انفاق:

ممکن ہے بعض لوگوں کا گمان یہ ہو کہ انفاق فقط معاشرتی خلاؤں کو پر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ لہذا کہا جاتا ہے کہ اگر حکومت اس مسئلے کو اپنے ذمہ لے کر خاص ادارے تشکیل دے جن سے غربت و فقر کا خاتمہ ہو جائے تو پھر فردا فردا انفاق کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ انفاق صرف خلاؤں کے پر کرنے کو نہیں کہتے بلکہ اس کا تعلق "تربیت پانے" سے ہے۔

کسی انسان کے پاس کوئی چیز ہو اور وہ اسے اپنے آپ سے جدا کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا مظہر بن جائے تو یہ عمل اس کی تربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ عطوفت مادۂ عطف سے ہے۔ اس کے معنی دوسروں کی جانب میلان رکھنے

اور توجہ دینے کے ہیں یعنی دوسروں کے ساتھ ایک ہو جانا اور ان کے دل کے ساتھ اپنا دل ملانا۔ یہ بجائے خود ایک بنیادی اور اہم مقصد ہے۔ اگر معاشرہ میں یہ فکر نہ پائی جائے تو ایسا ہی ہے جیسے گھریلو زندگی میں محبت و عطوفت مفقود ہو جائے اور اس کی جگہ تربیتی ادارے قائم ہو جائیں۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ کیا گھریلو زندگی کا فلسفہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے کہ والدین اپنے بچوں کو پالیں' انھیں خطرات و حوادث سے بچائیں' بیماری کے وقت ان کی تیمارداری کریں اور بس؟ بچوں کی اس طرح کی تربیت کا تعلق قدیم زمانہ سے ہے۔ لیکن اب جبکہ معاشرے تکامل کے مراحل طے کر چکے ہیں خاندانوں کے یہ فرائض بڑے بڑے سرکاری اداروں کو سونپ دیئے جانے چاہئیں۔ اب تو ہسپتالوں میں بچوں کو پیدائش کے بعد ان کو سیدھا تربیت اطفال کے مراکز میں لے جانا چاہیے جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ انھیں پلنا بڑھنا ہو گا۔ اس طرح ان اداروں کو والدین کی جگہ لے لینا چاہیے اور قدیم زمانہ میں والدین کے جو حقوق اولاد کے ذمہ ہوتے تھے اور اولاد کی نسبت والدین کے جو فرائض تھے' اب وہ سب حکومت و قوم کے روابط میں بدل جانے چاہئیں۔

لیکن اس نظریہ میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ یہ انسانی فطرت کے راستہ سے ہٹا ہوا ہے کیونکہ والدین کو ممتا اور پدرانہ احساسات کے ساتھ خلق کیا گیا ہے اور اولاد کو اولاد والے جذبات کے ساتھ۔ یعنی ماں اس بنا پر کہ وہ صرف ایک ماں ہے اپنے بچے کو اپنی آغوش محبت میں پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ یہ چیز اس کی فطرت میں شامل ہے اور یہ عمل اس حد تک غیر شعوری ہوتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

دوسری جانب ماں جب اپنے بچے کے چہرے پر محبت بھرے بوسے دیتی ہے' اسے اپنے سینے سے لگاتی ہے تو وہ اپنے اس عمل سے اسے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس میں محبت کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہے۔ یعنی والدہ کی محبت برقی توانائی بھرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ لہٰذا جب وہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو ان توانا آثار

محبت کے مظاہر نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پس وہ دوسروں کو محبت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یتیم خانوں میں پلنے والے بعض بچے جنہوں نے ماں کی آغوش اور باپ کی محبت نہیں دیکھی ہوتی بعض اوقات خطرناک مجرم بن جاتے ہیں۔

انفاق کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ اس کا فقط ایک پہلو نہیں دیکھنا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اس کا مقصد صرف بھوکوں کا پیٹ بھرنا ہے۔ لہٰذا یہ کام دوسرے ذرائع سے بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انفاق کا مقصد تربیت انسانی ہے کیونکہ انسان میں درگذر، بخشش اور ایثار کے ذریعہ انسانی روح پیدا ہوتی ہے۔ بنابریں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ایک قانع انسان ہوں، ایک بادام پر گزارہ کر لیا ہوں، مجھے اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا میں ایک کامل انسان ہوں۔ یہ کہنا درست نہیں ہے۔ جو شخص مال حاصل کر سکتا ہو اسے حاصل کرنا اور اس کی بخشش و سخاوت کے ذریعہ اپنے آپ کو کامل کرنا چاہیے۔ نادار ہونا اور نہ دینا کمال نہیں ہے بلکہ دولت حاصل کر کے اپنے آپ سے اسے الگ کرنا انسان کی تربیت کا موجب بنتا ہے۔

قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے یہ نکتہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کیا جا رہا ہے:

"خذ من اموالھم صدقة تطھرھم و تزکیھم" (توبہ / ۱۰۳)

(اے رسولؐ! آپ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لے لیجئے تاکہ اس کے ذریعہ یہ پاک و پاکیزہ ہو جائیں۔)

اس آیت میں بھی صدقہ کے تربیتی پہلو کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اس کے معاشرتی پہلو یعنی ناداروں کے پیٹ بھرنے کی جانب نہیں، کیونکہ اس میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے اموال سے صدقہ لے لیں جس کے ذریعہ سے آپ، ان کو پاکیزہ کر دیں گے، ان کو رشد عطا فرمائیں گے، بالکل اسی طرح جیسے تلائی کرتے رہنے سے پودا زیادہ نشوونما پاتا ہے، بلکہ ہر زندہ شے ایسی ہی ہے کہ اس کو پیش آنے والی آفتوں کی روک تھام کے ذریعے اس کی نشوونما میں اضافہ ہوتا ہے۔

والذین یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک

(یعنی وہ ان تمام باتوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں (اے رسولؐ) ہم نے آپ پر نازل کیا اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہیں)

متقین کی ایک اور صفت وحی پر ایمان ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس پر ایمان نہ رکھتا ہو یعنی وہ اسے دنیا کی عظیم کتابوں میں سے ایک کتاب تو تسلیم کرتا ہو اور معتقد ہو کہ اس کتاب کی تعلیمات نجات دلانے والی ہیں لیکن اس بات پر ایمان نہ رکھتا ہو کہ یہ کتاب وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے۔

اکثر غیر مسلموں کا شاید یہی نظریہ ہے۔ وہ جب تعلیم و تربیت کی کتابوں کے نام لیتے ہوئے قرآن کریم کو بھی ان میں شامل کرتے ہیں۔

"در آغوش خوش بختی" نامی کتاب کا مصنف جس فصل میں مطالعہ کو زیر بحث لاتا ہے اور تربیت سے متعلق کتابوں کا نام لیتا ہے تو اس میں قرآن کریم کا ذکر بھی کرتا ہے۔

عرب مادہ پرست شاعر شبلی شمیل نے پیغمبرؐ اکرم اور قرآن کریم کے بارے میں بہت دلچسپ اشعار کہے ہیں۔

تفسیر المنار کے مصنف رشید رضا مصری کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

انی و ان اک قد کفرت بدینہ

هل اکفرن بمحکم الایات

یعنی اگرچہ میں اسؐ کے دین کا انکار کرتا ہوں لیکن کیا میں اسؐ کی محکم آیات کا بھی انکار کر دوں؟!

اس طرح قرآن کریم کو تسلیم کرنا اس پر ایمان رکھنا نہیں بلکہ ایمان بالقرآن کے معنی یہ ہیں کہ 'انسان معتقد ہو کہ قرآن وحی پروردگار ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے' جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"**نزل بہ الروح الامین علٰی قلبک لتکون من المنذرین**" (شعراء / ۱۹۳۔۱۹۴)

(یعنی اسے جبرئیل امین لے کر نازل ہوئے۔ یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں۔)

یعنی انسان اس کو ایسی کتاب جانے جو ان پیغامات کا مجموعہ ہے جو عالم غیب سے عالم شہود تک پہنچے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ ایمان بالغیب میں وحی بھی شامل ہے۔ اس کا علیحدہ ذکر کرنا اجمال کے بعد تفصیل کو ذکر کرنا ہوگا۔ وحی کا مسئلہ چونکہ مسائل متعلق بہ پروردگار کی مانند واضح نہیں ہے اس لیے اسے علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

وبالاخرة هم يوقنون

یعنی وہ لوگ جو روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

لفظ "آخرة" جس کو فارسی میں آخرت کی صورت میں لکھا جاتا ہے' لفظ "آخر" کا مونث ہے' جو لفظ "اول" کی ضد ہے۔ اسی طرح "اول" کا مونث "اولیٰ" ہے۔ یہ جو قرآن کریم میں لفظ آخرة کا مونث کی صورت میں ذکر ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر دوسرے مقامات پر یہ دوسرے مونث الفاظ مثلاً "دار" یا "حیاۃ" وغیرہ کی صفت کے طور پر لایا گیا ہے اور چونکہ موصوف مونث ہے اس لیے صفت کو بھی اس کی پیروی میں مونث کی صورت میں ادا کیا گیا ہے۔ لفظ "آخرة" بعض اوقات لفظ "دنیا" کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ دنیا ممکن ہے کہ "دنو" کے مادہ سے ہو جس کے معنی قرب و نزدیکی کے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا مادہ "دنی" بمعنی پست ہو۔ اگر یہ دنو سے مشتق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کی زندگی ہمارے نزدیک تر ہے' ظاہر ہے کہ پھر آخرت کی وہ زندگی ہوگی جو ہم سے دور تر ہو۔

اس کے برعکس اگر "دنی" سے مشتق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ زندگی اس دوسری زندگی کی نسبت پست تر ہے اور آخرت یعنی وہ زندگی جو اس سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

لیکن سورۂ والضحیٰ میں "آخرۃ" کو "اولیٰ" کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے آپ وحی کے منقطع ہونے سے آزردہ نہ ہوں۔ آپ کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا نہیں۔ **"ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ"** آپ کا پروردگار لوگوں کی ہدایت کے سلسلے میں آپ کی آرزوؤں کو ضرور پورا کرے گا تاکہ آپ خوش ہو جائیں۔ **"وللاخرۃ خیر لک من الاولیٰ"** یعنی آپ کا انجام کار آپ کے آغاز کار سے بہتر ہے' یعنی آپ جس قدر آگے جائیں گے بلند پایہ کمال تک پہنچیں گے۔

بہر حال یہاں جو **"وبالاخرۃ ھم یوقنون"** فرمایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے قرآن سے ہدایت پائی وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے اور وہی جزا و سزا کی جگہ ہے۔

آخرت پر اعتقاد ہیشگی کا معتقد ہونے کے مترادف ہے۔ کیونکہ دنیا و آخرت کے درمیان یہی فرق ہے کہ دنیا فانی ہے جبکہ آخرت ابدی ہے انسان خواہ سعادت سے ہمکنار ہو یا شقاوت سے۔ یاد رہے کہ بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کو کچھ عرصہ تک شقاوت کا سامنا ہوگا اور اس کے بعد ابدی سعادت سے ہمکنار ہوں گے جبکہ بعض افراد ایسے ہیں جن کو ابدی شقاوت و بدبختی کا سامنا کرنا ہوگا " خلود" کے یہی معنی ہیں جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں آیا ہے۔

دائمی زندگی کا اعتقاد مکاتب الٰہیہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے اور یہی نظریہ کائنات کی توجیہ کر سکتا ہے کیونکہ مادی مکاتب فکر جو دائمی زندگی کے معتقد نہیں ہیں وہ انسان کو ایک حباب کی مانند تصور کرتے ہیں جو پھٹ جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان بے بنیاد نظریات کا قائل ہو اور کائنات کے بارے میں بدگمان ہو جائے۔

ان کے طریق فکر کے اس نتیجہ نے انہیں بہت پریشان کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کے بعض مادہ پرستوں نے اپنے مکتب فکر کو بے بنیاد ہونے سے بچانے کے لیے ایک نئی چال چلی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ فرد فنا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ معاشرہ تکامل کے راستے پر گامزن ہے لہٰذا فرد کا سفر جاری رہتا

ہے۔ لہٰذا اگر آپ یا میں قتل بھی ہو جائیں تو چونکہ ہمارا راستہ دوام کا ہے لہٰذا ہم بھی جاوید ہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی توجیہات کے ذریعہ اپنے مکتب فکر کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ کچھ لوگ قرآن کے مفاہیم کو انہی نظریات پر منطبق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ **"بالآخرۃ ھم یوقنون"** کے معنی یہ ہیں کہ متقین وہ لوگ ہیں جو عالم کے ایک برتر و مکمل نظام پر ایمان رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ فرد جاوید نہیں ہے بلکہ اس کی نوع جاوید ہے۔

ان مادہ پرستوں سے ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ اگر ہم فرد کی جاودانی کے قائل نہ ہوں تو پھر نوع بھی جاوداں نہیں ہو سکتی کیونکہ ماہرین طبیعات کے حساب کے مطابق زمین کی عمر کے کروڑوں سال گزر جانے کے بعد ایک دن ایسا آئے گا جب نہ زمین رہے گی اور نہ ہی اس پر کوئی انسان باقی رہے گا۔ اس صورت میں جاودانی نوع کے کیا معنی ہوں گے!

"اولئک علیٰ ھدی من ربھم"

یعنی وہ لوگ اپنے پروردگار کی ہدایت پر قائم ہیں۔ پروردگار جو کائنات کا مربی اور پالنے والا ہے۔ وہ تمام موجودات کی ہدایت ان کے کمال کی جانب کرتا ہے۔ وہ بعض کی تکوینی ہدایت کرتا ہے اور انسان کی تشریعی۔ یعنی انسان کی ہدایت اپنے انبیا و مرسلین کے ذریعے کرتا ہے۔ لیکن صرف ایسے افراد ہی ہیں جو حق تعالیٰ کی ہدایت تشریعی کے ذریعہ کمال تک پہنچے ہیں۔

"واولئک ھم المفلحون"

صرف یہی لوگ فلاح یافتہ ہیں' ان کے سوا باقی کوئی جماعت فلاح یافتہ نہیں ہے۔

سورۂ بقرہ میں ایمان کی بحث یہاں اپنے اختتام کو پہنچتی ہے اور کفر کی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

"ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون"

یعنی اے رسولؐ جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ان کے لیے برابر ہے کہ

آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے دو الفاظ کی وضاحت کریں پھر مذکورہ آیت کے مفہوم کو زیر بحث لائیں۔

لفظ کفر "کفر" سے مشتق ہے' جس کے معنی ستر یعنی چھپانے کے ہیں۔ قرآن کریم منکرین دین کو "کافر" کہتا ہے کیونکہ ان پر حقیقت کھل چکی ہوتی ہے لیکن وہ اس کو تسلیم کرنے کی بجائے اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

یہاں انذار کا ترجمہ عموماً "ڈرانا" کیا جاتا ہے' لیکن یہ ترجمہ پورے معنی نہیں دیتا۔ کیونکہ "ڈرانا" تو "تخویف" کا ترجمہ ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی مقام سے گزر رہا ہو اور اچانک کوئی اس کے آگے پٹاخہ چھوڑ دے تو وہ ڈر جائے گا۔ اس کو تخویف کہتے ہیں انذار نہیں کہتے۔

انذار خطرہ سے خبردار کرنے کو کہتے ہیں یعنی اگر کسی کا مستقبل خطرے میں ہو اور آپ پہلے ہی اسے اس کی خبر دے دیں اور اس کو ڈرائیں تو ڈرانے کی اس خاص قسم کو انذار کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "ہشدار" (خبردار کرنا) جو آج کل فارسی زبان میں رائج ہو چکا ہے اس مفہوم کے قریب تر ہے۔ یعنی انبیائے کرام خبردار کرنے والے ہوئے ہیں۔

اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو فرمایا ہے کہ آپ چاہے کافروں کو خبردار کریں یا نہ کریں' اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے' تو اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا انبیائے کرام کی دعوت مومنین کے ساتھ مختص ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہو تو یہ تحصیل حاصل ہو گی۔ کیونکہ انبیا تو آئے ہی اس لیے ہیں کہ کافروں کو مومن بنائیں۔ وہ مومنین کو مومن بنانے کے لیے نہیں آئے۔

بعض لوگوں نے اس کو دلیل بناتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن کریم نے معاشرہ اور تاریخ کی توجیہ کرتے ہوئے معاشرے کی مادی توجیہ کی ہے' یعنی ان کا کہنا ہے کہ لوگ دو طرح کے ہیں' ایک وہ جن کا استحصال کیا جاتا ہے اور دوسرے وہ جو استحصال کرتے ہیں۔ جن کا استحصال کیا گیا ہو فقط وہی دعوت قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور نبی اکرمؐ فقط انہی کے لیے بھیجے گئے ہیں اور آپؐ کے

مخاطبین بھی یہی لوگ ہیں۔ استحصال کرنے والا گروہ رسول اللہؐ کی دعوت کے دائرہ سے باہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تاویل انتہائی بے بنیاد و نامناسب ہے کیونکہ قرآن کریم کا خطاب عام ہے اور رسولؐ اللہ کے مخاطبین بھی سب لوگ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: "**یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا** (اعراف / ۱۵۸) (یعنی اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔)

ناس کے معنی سب لوگوں کے ہیں۔ یہ کتنا غلط ہے کہ ناس سے مراد محروم لوگوں کا گروہ ہے' پیغمبر اکرمؐ سب انسانوں کے لیے تشریف لائے ہیں' آپؐ کی دعوت سیاہ فام' سفید فام' استحصال کرنے والوں' جن کا استحصال کیا گیا ہو اور غریب و غنی سب کے لیے ہے۔ لہذا اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟

قرآن مجید میں کافر کا لفظ اگرچہ تمام مقامات پر نہیں تاہم اکثر مقامات پر ہر غیر مسلم کے لیے استعمال نہیں ہوا بلکہ رآن مجید نے ان لوگوں کو کافر فرمایا ہے جنہوں نے نبی اکرمؐ کے مبعوث ہونے' آپؐ کی طرف سے دعوت دیئے جانے' نیز حق کے آشکار ہو جانے کے بعد آپؐ کی مخالفت کی اور آپؐ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا' یعنی نبی اکرمؐ کی دعوت سے پہلے لوگ نہ تو مومن تھے نہ ہی کافر' نہ ہی منافق بلکہ وہ **الناس** کے زمرہ میں آتے تھے۔

آپؐ کے مبعوث ہونے اور دعوت دینے کے بعد لوگ تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک جماعت مومن ہو گئی دوسری نے انکار کیا اور تیسرے گروہ نے ظاہر میں تو دعوت رسولؐ کو قبول کر لیا لیکن باطن میں مخالف رہے۔

اس آیت سے مقصود یہ نہیں ہے کہ کفار وہ لوگ ہیں جو پہلے ہی اسلام نہ لائے بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کو آپؐ نے دعوت دی' حقیقت کا علم حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنی عقل و خرد کی مخالفت کی اور آپؐ کی تکذیب کی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"**وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا**" (نمل / ۱۴)

یعنی ان لوگوں نے ظلم و غرور کے جذبہ کی بنا پر انکار کر دیا ورنہ ان کے

دل یقین رکھتے تھے۔

اگر انسان کی روح حق کے سامنے جھک جانے والی ہو تو حقیقت کے سامنے آجانے پر وہ اسے تسلیم کر لیتا ہے۔ حقیقت کے مقابلہ پر آجانا ہی دراصل انسان کو ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے۔ درحقیقت اکثر لوگ ایسے ہی ہیں جو پہلے سے ہی حقیقت کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک آیت میں اس طرح کی ہٹ دھرمی کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"و اذ قالوا اللهم ان كان هذا هو الحق من عندك فامطر علينا حجارة من السماء" (انفال / ۳۲)

یعنی اور اس وقت کو یاد کرو جب انہوں نے کہا کہ خدایا اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے۔

بالفاظ دیگر جب انہوں کہا کہ اے اللہ اگر یہ قرآن حق ہے' تیری جانب سے نازل ہوا ہے تو آسمان سے ایک پتھر نازل کر اور ہمیں نابود کر دے کیونکہ ہم اس کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے۔

دوسرے لفظوں میں انہوں نے یہ کہنے کی بجائے کہ اے ہمارے پروردگار اگر یہ حق ہے اور تیری طرف سے نازل ہوا ہے تو ہمیں اس کے قبول کرنے کی توفیق عطا فرما' یہ کہا کہ اگر یہ حق ہے تو ہم کو فنا کر دے۔

حق کے مقابل آجانے کے یہی معنی ہیں۔ اس قسم کے افراد کو خبردار کرنا بے سود ہے اور فقہا کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو **مقصر** کہتے ہیں' قاصر نہیں کہتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جو شخص مسلمان نہ ہو وہ کافر ہی ہے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں قرآن کریم کی زبان میں کفر کے معنی انکار کرنے یا چھپانے کے ہیں اور کافر کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جنہوں نے حق تعالیٰ کے فرستادہ اور دین الٰہی لانے والوں کے خلاف صف آرائی کی اور ان کی مخالفت پر جنی رد عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے منفی موقف اختیار کیا۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ جن لوگوں کے سامنے اسلام یا کوئی

اور دین پیش ہی نہیں کیا گیا یعنی انہوں نے نہ تو اس کی مخالفت کی اور نہ ہی موافقت کا اظہار کیا' ان افراد کو کیا کہا جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ لوگ مومن تو نہیں ہیں' ان پر مومنین کے لیے مختص احکام کا اجرا بھی نہیں ہو سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت جیسی آیات کا بھی اطلاق ان پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف دعوت انبیا کے نتیجہ میں ہی تین گروہ (مومن' کافر' منافق) وجود میں آتے ہیں۔

کفر مقدس

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتلاتے چلیں کہ چونکہ لفظ کفر کے لغوی معنی "چھپانے" "مخالفت کرنے" اور "صف آرائی کرنے" کے ہیں لہذا قرآن کریم میں بعض مقامات پر کفر کا لفظ مقدس شکل میں ظاہر ہوا ہے یعنی ان مقامات پر کفر کے معنی باطل کے خلاف صف آرائی کرنے کے ہیں۔ یہ بات سب سے زیادہ آیت الکرسی میں واضح ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ.." (بقرہ/۲۵۶)

یعنی دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا۔

دوسرے لفظوں میں ہر مومن کو کافر بھی ہونا چاہیے یعنی حق پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ باطل کے خلاف بھی اٹھ کھڑا ہو یعنی باطل کا انکار کرے۔ یہی کفر مقدس کہلاتا ہے۔

اہل تشیع معتقد ہیں کہ فروع دین دس ہیں جن میں نویں اور دسویں کو تولیٰ اور تبریٰ کہا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا معتقد ہونا چاہیے لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک حالت نفی بھی ضروری ہے یعنی جو چیز امیر المومنین علیہ السلام اور

آپؐ کے طرز عمل کے خلاف ہو اس کی نفی اور انکار کرے۔ زیر بحث مسئلے میں بھی صرف ایمان باللہ کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی طاغوت کی نفی بھی لازم ہے۔

ختم اللّٰہ علی قلوبھم و علیٰ سمعھم و علیٰ ابصارھم غشاوۃ

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔
یہ اس طرح ہے کہ جب خط لکھا جاتا ہے تو اس کے اختتام پر مہر لگادی جاتی ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس میں مزید کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم فرماتا ہے کہ ہر شخص کا دل ایک خط کی مانند ہے جس پر بتدریج اچھی یا بری سطریں تحریر کی جاتی ہیں۔ جب یہ خط اپنے اختتام کو پہنچتا ہے تو اسے سربمہر کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں اچھے یا برے کسی ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ کافروں پر انبیاؑ کی دعوت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قرآن کریم رسول اللہؐ سے فرماتا ہے کہ اب کے بعد ان لوگوں کو دعوت نہ دیجئے۔ ایسا نہیں ہے کہ شروع سے ہی ان کو دعوت دینے کو بے نتیجہ قرار دیا گیا ہے بلکہ چونکہ ان کو خبردار کیا جا چکا ہے' ان کو دعوت دی جا چکی ہے ان پر حجت تمام ہو چکی ہے' لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ کفر اختیار کر لیا ہے اور اسی کفر و انکار کی بنا پر ان کے دلوں کی یہ حالت ہو چکی ہے۔
قرآن کریم کے نزدیک انسان ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ تبدیلیوں کی زد میں رہتی ہے۔ قلب انسانی کو اس کے "تقلب" کی وجہ سے ہی قلب کہا جاتا ہے یعنی چونکہ یہ زیر و زبر ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں ہے جو سینے کے بائیں حصہ میں ہے بلکہ مقصود انسانی روح ہے جو ہر آن بدلتی رہتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

"مثل القلب کمثل ریشۃ فی الفلات تعلقت فی اصل شجرۃ

یقلبها الریح ظہرا لبطن (۱۴)

دل کی مثال اس پر کی مثال ہے جس کو بیابان میں ایک درخت پر آویزاں کر دیا گیا ہو اور ہوا اسے ہر وقت ہلاتی رہتی ہو۔

مولانا رومؒ اس حدیث کو اشعار میں ڈھالتے ہوئے کہتے ہیں:۔

گفت پیغمبرؐ کہ دل ہمچون پری است
در بیابانی اسیر صرصری است
باد پر راہر طرف راند گزاف
گر چپ و گر راست با صد اختلاف

یعنی "رسول اکرمؐ فرماتے ہیں کہ قلب انسانی ایک پر کی مانند ہے جو جنگل کی ہوا کے اختیار میں ہوتا ہے۔ یہ ہوا اسے کبھی دائیں کبھی بائیں یعنی ہر مختلف سمت میں اڑاتی رہتی ہے۔"

انسان کبھی دو لحموں میں ایک حالت میں نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ وہ اپنے اعمال کے زیر اثر ہوتا ہے۔ نورانی کام اسے نور عطا کرتے ہیں اور برے کام انسان سے نور چھین کر قلب انسانی کو تاریک کر دیتے ہیں۔ نیک کام انسان کے دل کو نرم بناتا ہے اور اسے نصائح و حق و حقیقت تسلیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے جبکہ انسانی فطرت کے منافی اعمال اس کے لیے سنگدلی کا موجب بنتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کا دل اس حد تک سیاہ ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم اس کے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ اب اس کا کام تمام ہو چکا یعنی اس کے دل پر مہر لگ چکی ہے۔ وہ اپنی آنکھ سے دیکھتا تو ہے لیکن نہ دیکھنے کے برابر۔ گویا اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے۔ "**وعلی ابصارھم غشاوۃ**۔"

یہ کفر کے اثرات ہیں اسباب نہیں۔ اس تفصیل سے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

و من الناس من یقول امنا باللّٰہ و بالیوم الاخر وما ھم بمومنین ○ یخادعون اللّٰہ والذین امنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون ○ فی قلوبھم مرض فزادھم اللّٰہ مرضا و لھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون ○ و

اذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون ○ الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون ○ و اذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفھاء الا انھم ھم السفھاء ولکن لا یعلمون ○ و اذا لقوا الذین امنوا قالو امنا و اذا خلوا الی شیاطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزؤن ○ اللہ یستھزی بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون ○ اؤلئک الذین استروا الضلالۃ بالھدی فمار بحت تجارتھم وما کانوا مھتدین ○

ترجمہ :۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ صاحب ایمان نہیں ہیں۔ یہ اللہ اور صاحبان ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں جبکہ دراصل یہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور سمجھتے بھی نہیں۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے اور اللہ نے نفاق کی بنا پر اسے اور بڑھا دیا ہے۔ اب اس جھوٹ کے نتیجہ میں انہیں دردناک عذاب ملے گا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں حالانکہ یہ سب مفسد ہیں اور اپنے فساد کو سمجھتے بھی نہیں ہے جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے مومنین کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان اختیار کر لیں حالانکہ اصل میں یہ خود بیوقوف ہیں اور اس حقیقت سے آگاہ بھی نہیں ہیں۔ جب یہ صاحبان ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیاطین کی خلوتوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہاری ہی جماعت ہیں ہم تو صرف صاحبان ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں جبکہ اللہ خود ان کا مذاق بنائے ہوئے اور انہیں سرکشی میں ڈھیل دیئے ہوئے ہے جو انہیں نظر نہیں آرہی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کو دے کر گمراہی خرید کی ہے جس تجارت سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اس میں کسی طرح کی ہدایت ہے۔

و من الناس من یقول امنا باللہ و بالیوم الاخر وما ھم بمومنین

چونکہ منافقت کفر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اس لیے قرآن کریم نے کفر

کے بارے میں صرف دو آیات میں بحث فرمائی ہے جبکہ منافقت کو کئی آیتوں میں زیر بحث رکھا ہے۔ قرآن مجید کی کم و بیش تیرہ سورتوں میں مختلف عناوین سے منافقین کو زیر بحث لایا گیا ہے اور سورۂ ۶۳ جو سورۂ منافقین کے نام سے موسوم ہے انہی کے ساتھ مختص ہے۔

منافقت کی تعریف!

منافقت یعنی دو رخی' یعنی یہ کہ انسان کا باطن کچھ ہو اور ظاہر کچھ اور۔ اگرچہ یہ خصلت انسان میں نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک مذموم خصلت ہے تاہم اس حقیقت کے باوجود یہ انسان کے کمال سے جنم لیتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان تمام حیوانات میں سب سے زیادہ تکامل یافتہ ہے لہٰذا وہ بناوٹ و ظاہردار پر قادر ہے جبکہ دیگر حیوانات عموماً یا ان میں سے اکثر منافقت پر قادر نہیں ہیں۔ صرف چند ایک حیوانات دوسروں کی نسبت زیادہ سوجھ بوجھ رکھتے اور کسی حد تک بناوٹ کی طاقت رکھتے ہیں۔ مثلاً بعض پرندے' گھوڑے و خچر جیسے جانور ہرگز یہ کام انجام نہیں دے سکتے جبکہ بلی کسی حد تک ایسا کر سکتی ہے۔ لہٰذا وہ چوہے یا چڑیا کو شکار کرتے وقت اس صلاحیت سے فائدہ اٹھاتی ہے اور کمین میں بیٹھ کر شکار کرتی ہے۔ لومڑی بھی اسی طرح ہے اور اس کی فریب کاری ضرب المثل بن چکی ہے۔ بھیڑیا بھی مکرو فریب کے ذریعہ بعض اوقات اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن کوئی حیوان انسان کی مانند تصنع پر قادر نہیں ہے۔ انسان کے اس عمل کو مختلف طریقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے' مثلاً بلی چوہے کا کھیل' گندم دکھا کر جو بیچنا کے یہی معنی ہیں۔ ایسے جملے ہی ان مفاہیم کو ادا کرتے ہیں۔ یا مثلاً یہ کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بھیڑیے کے ساتھ بیٹھ کر بھیڑ کا گوشت کھاتا ہے اور گڈریے کے سامنے آنسو بہاتا ہے۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ منافقت انسان کے تکامل سے جنم لیتی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ بادیہ نشین ہوگا اسی قدر اس میں منافقت کم ہوگی۔ بچے میں منافقت نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ جس محفل میں بیٹھا ہو اور اس کو جو کھانا بھی پیش کیا جائے اگر وہ اس کی طرف میلان رکھتا ہو تو اس کو کھانے لگے گا حتیٰ کہ اگر

کھانے کو اس کا دل چاہ رہا ہو تو دوسروں کی جانب سے کھانا پیش ہونے سے قبل ہی وہ رو کر اپنے میلان و رغبت کا اظہار کرتا ہے لیکن بڑا آدمی جب کسی محفل میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کو کھانے کے لیے کہا جائے تو وہاں موجود کھانوں کی طرف شدید میلان رکھنے کے باوجود اکثر کہتا ہے کہ جی نہیں چاہ رہا جبکہ بچہ ایسا جھوٹ نہیں بولتا۔

تمدن کے اعتبار سے انسان جس قدر زیادہ ترقی کر رہا ہے اس میں منافقت کی قوت بڑھ رہی ہے۔ ہزار سال پہلے کے بشر میں آج کے بشر کی نسبت ایک فیصد منافقت بھی نہیں پائی جاتی تھی۔

کیا آپ اس نکتہ کی طرف متوجہ ہیں کہ آج کل جو الفاظ رائج ہیں ان میں بہت سے الفاظ منافقانہ ہیں؟ مثلاً "استعمار" کا لفظ جو لغوی اعتبار سے بہت اچھا لفظ ہے جیسا کہ قرآن کریم نے بھی اس کو اصلی معنی میں استعمال فرمایا ہے۔

"هو الذی انشاء کم من الارض و استعمر کم فیها فاستغفروه"

(ھود / ٦١)

یعنی اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں پیدا کیا اور اسی میں تم کو استعمار (یعنی آباد) فرمایا۔

استعمار باب استفعال سے ہے اور "**عمران**" کے مادہ سے **استعمر** کے معنی یہ ہیں کہ وہ تم سے زمین کی آباد کاری کا طلب گار ہوا۔ اس نے تم کو زمین پر خلق فرمایا اور تمہیں مکلف کیا کہ زمین کو آباد کرو۔ پس استعمار کے معنی "آباد کرنے" کے ہیں۔

سامراجی ممالک جہاں بھی جاتے یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم تمہارے مفادات کو غصب کرنے آئے ہیں بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم تمہاری زیر زمین دولت کو بروئے کار لانے کے لیے آئے ہیں۔ یہاں تک کہتے کہ ہم تمہاری زمینوں کو آباد کرنے کے لیے آئے ہیں۔ بظاہر وہ یہ کام کرتے بھی تھے مثلاً ایک دو سڑکیں بنا دیتے۔ لیکن جس قدر کام وہ لوگوں کے لیے کرتے تھے اس سے ہزاروں گنا زیادہ ان کے مفادات لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اس ذریعہ سے وہ ان ممالک کے لوگوں کو اپنا غلام

بنا لیتے۔ لہٰذا استعمار ایک منافقانہ لفظ بن گیا ہے یعنی اسے اس کے حقیقی معنی میں استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔

عیسائی مبلغین جن کو اپنی اصطلاح میں وہ مبشرین کہتے ہیں' استعمار کا ہراول دستہ تھے۔ یہی لوگ استعمار کی نو آبادیاں قائم کرنے کی راہ ہموار کرتے تھے' عوام کو حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کی صفات بتاتے لیکن کچھ عرصے کے بعد لوگ محسوس کرنے لگتے کہ مذہب کی آڑ میں ان کا تمام مادی سرمایہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

ایک افریقی کا قول ہے کہ "جب فرنگی ہمارے ممالک میں آئے تو اس وقت زمین ہمارے پاس تھی اور انجیل ان کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن چالیس پچاس سال گزرنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ انجیل ہمارے ہاتھ میں ہے اور زمین ان کے ہاتھ میں۔ یہی منافقت ہے۔

قرآن کریم نے منافقین کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے وہ اس لیے کہ درحقیقت مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ ہمیشہ منافقین سے ہوشیار رہیں' ان کے دھوکے میں نہ آئیں۔ کیونکہ منافق صرف صدر اسلام میں موجود نہ تھے بلکہ ہر زمانے میں رہے ہیں جو مسلمانوں میں انتشار پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کا دم بھرتے ہیں لیکن اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں۔

ستون پنجم کی اصطلاح آپ نے سنی ہو گی۔ غالباً پہلی عالمگیر جنگ کا واقعہ ہے کہ کسی ملک کی فوج کے چار اعلانیہ ستون تھے جو آتشیں اسلحہ کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک گروہ کو انہوں نے پہلے سے ہی دشمن کی فوج میں بھیج رکھا تھا جو اس کو بہکاتے رہتے اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چار اعلانیہ ستونوں سے قبل یہ ستون خفیہ طور پر کام کرتا۔ اس کا نام ستون پنجم (Fifth Column) رکھا گیا تھا جو دشمن کی فوج میں رہتا' اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرتا لیکن حقیقت میں اپنی فوج کے لیے کام کرتا تھا۔

قرآن کریم کہتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کو ہمیشہ اس پانچویں ستون کا خطرہ لاحق رہا ہے' گویا ان لوگوں کی جانب سے خطرہ رہتا ہے جو کہتے ہیں۔ "**امنا باللّٰہ و**

بالیوم الاخر وما ھم بمومنین۔ "یعنی ہم اللہ اور روز قیامت پر ایمان لے آئے ہیں لیکن یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔

یخادعون اللّٰہ والذین امنوا...

(یہ خدا اور صاحبان ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔)

اگر یہ ہوتا کہ "**یخدعون اللّٰہ**" یعنی اللہ کو فریب دیتے ہیں تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو فریب نہیں دیا جا سکتا' اس کو فریب دینا ناممکن ہے اس لیے یہ نہیں فرمایا گیا' بلکہ فرماتا ہے۔ "**یخادعون اللّٰہ**" یہ لوگ اللہ کے ساتھ **مخادعۃ** کرتے ہیں۔ **مخادعۃ** باب مفاعلہ سے ہے۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

"**وما یخدعون الا انفسھم**" یعنی حالانکہ وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔

انسان جب بھی اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے خود دھوکے میں آجاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لیے کہ حقیقت کو کبھی بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جو شخص حقیقتوں کو دھوکا دینے کی فکر میں ہوتا ہے فی الواقع وہ خود ہی دھوکا کھاتا ہے۔ طبیب کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے مگر علم طب کو نہیں۔ مثلاً انسان طبیب سے جھوٹ بول کر اسے دھوکا دے سکتا ہے۔ فرض کریں کہ طبیب مریض سے پوچھے کہ جو دوا میں نے تمہیں دی تھی کیا تم نے استعمال کی ہے؟ وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ ہاں استعمال کی ہے۔ درآنحالیکہ اس نے دوائی نہ کھائی ہو۔ الغرض اس نے طبیب کی ہدایات پر عمل نہ کیا ہو لیکن کہہ دے کہ میں نے عمل کیا ہے تو ایسی صورت میں طبیب تو دھوکے میں آجاتا ہے لیکن طب دھوکے میں نہیں آتی بلکہ در حقیقت جھوٹ بولنے والا خود ہی دھوکا کھاتا ہے۔ طبیب تو مریض کے بیانات کو سامنے رکھ کر ہی نسخہ تجویز کرتا ہے جس کی وجہ سے منافق و دروغ گو مریض کی بیماری میں روز افزوں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو جو خود ہستی حق و حقیقت ہے' دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے والے حقیقت میں خود دھوکا میں مبتلا ہوتے ہیں۔

یخادعون اللہ کے جملے کے متعلق ایک اور احتمال کا پایا جانا بھی ممکن ہے وہ یہ کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا' کیونکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے تھے تو اس صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے تب بھی اس پر ایمان رکھنے والا شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی فریب دیا جا سکتا ہے۔

پس اس جملے کا تعلق ایسے امور میں سے کسی ایک سے ہے جو اہل حق سے متعلق ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ساتھ منسوب فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے نظائر بہت ہیں۔

سورہ الفتح آیت ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ"

یعنی بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں در حقیقت وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں۔

زیر بحث آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اہل ایمان کو فریب دینے کے درپے ہیں فی الواقع انہوں نے خود کو فریب دیا ہے کیونکہ حق کے راستے اور صراط مستقیم پر چلنے والوں کی آخری منزل اللہ ہے' انہوں نے اپنے آپ کو حقیقت کے سپرد کر دیا ہے اور تسلیم کا یہی جذبہ ان کو نجات سے ہمکنار کرتا ہے ہرچند کہ یہ لوگ بظاہر چالاک و کامیاب زندگی گزارتے ہوئے نظر نہ آئیں جبکہ اپنے آپ کو چالاک جاننے والے اور ہمیشہ دھوکا دہی کے ذریعہ آگے نکلنے کی کوشش کرنے والے افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح بھی اہل حق کو دھوکا دے کر اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ حق و حقیقت کبھی دھوکا نہیں کھاتے' ہرچند کی اہل حق دھوکے میں آ بھی جائیں' لہٰذا اس طرح کے لوگ فریب و دھوکا دہی پر مبنی منصوبے

باندھتے ہیں مگر یہ منصوبے ان کے اپنے نقصان میں جاتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"**فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا و لھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون**"

یعنی ان کے دلوں میں بیماری ہے اور اللہ نے نفاق کی بنا پر اسے مزید بڑھا دیا ہے۔ اب جھوٹ کے نتیجہ میں انہیں دردناک عذاب ملے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصل وجہ بیان فرمائی ہے جو دل کی بیماری ہے۔ یہ لوگ روح اور نفس کے امراض میں مبتلا ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر بھی بھی دل کی بعض بیماریوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے' مثلاً تکبر کی بیماری' قدیم عقائد پر اڑے رہنے کی بیماری یعنی تعصب' باپ دادا اور اپنے بڑوں کی پیروی کا مرض' یہ سب روح کی ان بیماریوں میں سے ہیں جو انسان کو حقیقت تسلیم کرنے نہیں دیتیں۔ یہ بالکل فسق و فجور کی مانند ہیں جو انسان کے اندر ایک طرح کی ہٹ دھرمی پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ ایسے بیمار ہیں جن کی بیماری اللہ تعالیٰ ہمیشہ بڑھاتا رہتا ہے کیونکہ جو قانون انسان کے جسم سے متعلق ہے وہی اس کی روح سے بھی متعلق ہے۔ اگر کوئی شخص جسمانی طور پر مریض ہو کر طبیب کے پاس جائے لیکن ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے طبیب کے مشوروں پر عمل نہ کرے اور منافقانہ رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کی بیماری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایسی کھیتی قرار دیا ہے جس میں ہر بیج کو اگانے کی استعداد پائی جاتی ہے لیکن یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اس میں کیسا بیج بوتا ہے۔ گندم کے بیج سے گندم ہی اگتی ہے اور جو کے بیج سے جو حنظل کا پھول حنظل اور خرما کا خرما ہی ہوتا ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: "**کلا نمد ھولاء و ھولاء**" (اسراء/ ۲۰)

یعنی ہم ان کی اور ان کی سب کی مدد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کام مدد کرنا ہے۔ دنیا کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ جو شخص جس راستے پر چل رہا ہے اس میں کمال پائے چاہے وہ نیکوکار ہو یا بدکار

(البتہ اس فرق کے ساتھ جس کا ذکر ہم مناسب مقام پر کریں گے) ۱۳

ارشاد ہوتا ہے:

"واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون"

یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔

اس سے پہلے قرآن مجید میں منافقوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اس آیت سے منافقین کی خود فریبی بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کے ساتھ بہت جھوٹ بولتے ہیں آہستہ آہستہ انہیں اپنے جھوٹ سچ لگنے لگتے ہیں اور وہ بھول جاتے ہیں کہ اس جھوٹ اور افواہ کو انہوں نے خود ہی گھڑا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک بے وقوف کو کچھ بچے تنگ کرنے لگے۔ اس نے ان کو بھگانے کے لیے کہا کہ شہر کے فلاں محلّے میں خیرات تقسیم کی جا رہی ہے۔ بچوں نے یقین کر لیا اور اسے چھوڑ کر اس کے بتائے ہوئے محلے کی جانب بھاگنے لگے۔ جونہی اس بے وقوف نے سب بچوں کو جاتے دیکھا تو خود بھی ان کے پیچھے اس طرف چل پڑا اور دل میں کہنے لگا کہ شاید وہاں واقعی خیرات تقسیم ہو رہی ہو! قرآن کریم فرماتا ہے کہ اسی پانچویں ستون کے افراد سے' جن کا کام ظاہر میں مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کرنا جبکہ حقیقت میں اسلامی معاشرہ میں تخریب کاری کرنا' تباہی مچانا' خلل ڈالنا اور مقدس اسلامی مقاصد کو ناکام بنانا تھا' جب ان کے دوست کہتے کہ اس قدر فساد نہ کرو تو وہ جواب میں کہتے کہ ہم تو مصلح ہیں مفسد نہیں ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

"الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون"

یعنی حالانکہ یہ سب مفسد ہیں اور اپنے فساد کو سمجھتے بھی نہیں۔

در حقیقت یہی مفسد ہیں ان کے علاوہ اور کوئی مفسد ہے ہی نہیں' لیکن یہ خود بے شعور ہیں گمان کرتے ہیں کہ یہ مصلح ہیں گویا ان کو خود بھی (غلط طور پر)

یقین ہو چکا ہے کہ یہ واقعی مصلح ہیں۔

توجہ فرمائیں کہ قرآن کی یہ آیت کس طرح ان کو متعین کر رہی ہے۔

مثلاً ایک مرتبہ ہم کہتے ہیں کہ زید عالم ہے جبکہ دوسری مرتبہ کہا جاتا ہے کہ عالم زید ہی ہے۔ اس دوسرے جملے کے معنی یہ ہوئے کہ اگر اس دنیا میں کوئی عالم ہے تو بس زید ہی ہے اس کے مقابلہ میں کسی اور کو عالم شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زیر بحث آیت میں قرآن کریم نے اس طرح فرمایا ہے کہ درحقیقت مفسد صرف یہی ہیں یعنی دوسرے مفسد ان کے سامنے مفسد ہی شمار نہیں ہوتے کیونکہ یہ لوگ فساد و تباہ کاری کا پیکر بن چکے ہیں لیکن خود اس بات سے آگاہ نہیں ہیں۔

"و اذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفھاء" یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے مومنین کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی بیوقوفوں کی طرح ایمان اختیار کر لیں۔

جب تنہائی میں ان سے کہا جاتا ہے کہ اس منافقت سے باز رہو اور دوسرے لوگوں کی مانند ایمان لے آؤ تو جواب میں کہتے ہیں کہ ایمان لانا یا مذہب اختیار کرنا تو بے شعور و بے عقل لوگوں کا کام ہے۔ ہم جو کہ معاشرہ کے روشن فکر افراد ہیں کیا ان بے وقوف لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

"الا انھم ھم السفھاء و لکن لا یعلمون" یعنی حالانکہ اصل میں یہی بیوقوف ہیں اور یہ اس بات کو جانتے نہیں۔

قرآن کریم لفظ **"الا"** سے مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے۔ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی فرمایا گیا ہے کہ **"الا انھم ھم المفسدون"** چنانچہ فرماتا ہے کہ خبردار رہو یہی بے وقوف ہیں اور یہ اپنی تاریک فکر میں اس قدر گم ہو چکے ہیں کہ خود بھی نہیں جانتے۔

جہل کی دو قسمیں ہیں، جہل بسیط اور جہل مرکب۔ جہل بسیط یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو نہ جانتا ہو لیکن یہ بھی جانتا ہو کہ وہ نہیں جانتا۔ اس قسم کا جہل جلد دور ہو جاتا ہے کیونکہ جب انسان کسی چیز کو یہ جانتا اور سمجھتا ہو کہ وہ نہیں جانتا تو وہ دانائی کے قریب آ چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس کو جاننے اور اس سے باخبر ہونے کی

کوشش کرتا ہے یا کم از کم دوسروں کی بات توجہ سے سنتا ہے تاکہ اگر حقیقت ہو تو اسے تسلیم کرلے۔ ایسا جہل ہرگز زیادہ خطرناک نہیں ہوتا۔

جہل مرکب یہ ہے کہ انسان نہ جانتا ہو لیکن یہ بھی نہ جانتا ہو کہ وہ نہیں جانتا تو اس قسم کا جہل ناقابل علاج ہے کیونکہ غرور اس کے اس جہل کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ روشن خیالی کے اکثر دعویدار اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ سمجھتے کچھ نہیں لیکن سمجھنے کے دعویدار ہوتے ہیں۔ شیخ الرئیس بو علی سینا نے اپنی کتاب اشارات میں ایک جملہ تحریر کیا ہے اور اس وقت جس طرح میرے حافظہ میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ **"ایاک و فطانه بتراء"** ابتر یعنی ناقص چالاکی سے بچو۔ مراد یہ ہے کہ بہتر ہے کہ انسان یا تو سادہ لوح ہو یا بہت عقلمند و سمجھدار ہو۔

سادہ لوح افراد عموماً جانتے ہیں کہ وہ سادہ لوح ہیں جبکہ نیم چالاک لوگ جو صرف بعض امور میں چالاک ہوتے ہیں اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اپنے کاموں کو دانشمندانہ قرار دیتے ہیں۔ ایسے افراد سب سے زیادہ احمق اور مصیبتوں میں گرفتار رہتے ہیں۔

غزالی یہی بات ایک اور طرح کہتے ہیں کہ "ہر چیز کا ناقص ہونا اس کے عدم وجود سے بہتر ہے سوائے علم و دانش کے" یعنی انسان جس قدر سلامتی اور مال و دولت سے بہرہ ور ہو اس کے بالکل نہ ہونے سے بہتر ہے لیکن علم و دانش کا معاملہ ایسا نہیں۔ تھوڑا پڑھا لکھا شخص ان پڑھ سے بدتر ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو بہت زیادہ پڑھا لکھا سمجھتا ہے اور ہرگز اپنے علم کی تکمیل کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ شعر غالباً سنائی کا ہے۔

رنجش هر کسی ز یک چیز است
رنجش من ز نیم دیوانه است

یعنی ہر شخص کو کسی نہ کسی چیز کا دکھ ہوتا ہے لیکن میں تو نیم دیوانہ شخص سے دکھی ہوں۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ عقل بھی علم کی مانند ہے انسان کو یا تو بالکل دیوانہ

ہونا چاہیے یا عاقل کامل۔

آدھا پاگل اور آدھا عقلمند بالکل پاگل سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ معاشرہ کے چالاک و فریب کار افراد عموماً ایسے ہی نصف انسان ہوتے ہیں جو صرف نصف عقلمند ہوتے ہیں پورے عقلمند نہیں۔ کیونکہ جو لوگ مکمل عقلمند ہوتے ہیں وہ اگر کسی چیز پر بھی اعتقاد نہ رکھتے ہوں تو کم از کم یہ ضرور جانتے ہوتے ہیں کہ سعادت و کامیابی صداقت و سچائی میں مضمر ہے۔

نیم عقلمند لوگ جن سے اپنی زندگی میں مجھے بہت سے افراد سے واسطہ پڑا ہے' اپنی کامیابی اس بات میں سمجھتے ہیں کہ کسی کے ساتھ بھی خلوص کے ساتھ پیش نہ آئیں۔ یہ لوگ عمر بھر ایک دوست بھی نہیں بنا پاتے' نہ ہی ان کی باتوں پر کوئی اعتماد کرتا ہے کیونکہ جس سے بھی یہ بات کرتے ہیں وہ ان کی باتوں کو ان کی چالاکی پر ہی محمول کرتا ہے۔

قرآن کریم ان منافقوں کو جاہل مرکب بتلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے مگر خیال کرتے ہیں کہ سب کچھ جانتے ہیں۔ بے شعور ہوتے ہیں مگر اپنے آپ کو باشعور سمجھتے ہیں۔

"و اذا لقوا الذین امنوا قالوا امنا و اذا خلوا الیٰ شیاطینھم قالوا انا معکم انما نحن مستھزؤن" یعنی جب یہ صاحبان ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیاطین کی خلوتوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہاری جماعت سے ہیں ہم تو صرف صاحبان ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

قرآن کریم ان کی منافقت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ جب یہ لوگ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن جب اپنے شیاطین ہم خیال لوگوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں ورنہ عقیدہ و فکر کے اعتبار سے تو بالکل تمہارے جیسے ہی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم سابقہ آیت میں فرماتا ہے۔ **"وما یخدعون الا انفسھم"** اسی طرح یہاں فرما رہا ہے **"اللہ یستھزی بھم"** یعنی اللہ خود ان کو مذاق بناتے ہوئے ہے۔ یعنی وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ حقیقت کا تمسخر اڑایا جا سکتا ہے اور اس کو دھوکا

بھی دیا جا سکتا ہے جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقت در اصل ان کا تمسخر اڑاتی ہے' یعنی ان کے عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ہی کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

"و یمدھم فی طغیانھم یعمھون" اور انہیں سرکشی میں ڈھیل دیئے ہوئے ہے۔

یہ سرکش لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اتنے عرصے تک ان کی سرکشی میں رہنے دیتا ہے کہ مکمل طور پر حیرت و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کر رہے ہیں۔

-----OOO-----

یہاں تک قرآن مجید نے منافقین کے یہ چند خصائل بیان فرمائے ہیں۔

خصلت اول:

منافق ظاہرداری سے کام لیتے ہیں۔ درحقیقت ظاہرداری منافقین ہی کی خصوصیات میں سے ہے۔ اسی لیے منافق مومن سے بہتر اپنے ایمان کا اظہار کرتا ہے۔

خصلت دوم:

یہ لوگ دھوکا باز' مکار اور فریب کار ہوتے ہیں یہ بھی ان کی خاص صفات میں سے ایک ہے۔

خصلت سوم:

یہ لوگ ایک روحانی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں ایسے کاموں کے ذریعہ اپنے باطنی امراض کا علاج کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ امراض روحانی شفا پالیں حالانکہ ایسا کرنے سے ان کے باطنی امراض میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

خصلت چہارم:

حالات زندگی ان پر اس حد تک مشتبہ اور مشکوک بن جاتے ہیں کہ وہ خود

یہی خیال کرنے لگ جاتے ہیں کہ ان کے اعمال معاشرہ کی اصلاح کی طرف راغب ہیں یعنی انہوں نے اپنی تباہ کاریوں اور فساد کو اصلاح کا جامہ پہنا رکھا ہوتا ہے اور خود بھی اس بات پر یقین کر چکے ہوتے ہیں۔

خصلت پنجم:

یہ لوگ خود بے وقوف و احمق ہوتے ہیں مگر دوسروں کو احمق خیال کرتے ہیں۔

خصلت ششم:

ان کے دو رخ ہوتے ہیں۔ اس دو رخی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایک محفل میں ایک بات کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری محفل میں جا کر پہلی بات کے بالکل الٹ بات کہتے ہیں۔

یہ ہیں منافقین کی خصوصیات جن کو قرآن مجید نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔

اس مقام پر ہم چند اہم نکات کو زیر بحث لانا ضروری سمجھتے ہیں۔

ا۔ ایک نکتہ کا تعلق لفظ "ناس" سے ہے جو اس آیت میں آیا ہے: کہ "**ومن الناس من یقول امنا....**" بعض لوگ کہتے ہیں کہ ..... قرآن کریم میں ہم ان الفاظ سے زیادہ دو چار ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جملہ سے کیا مراد ہے؟ قرآن کریم میں "ناس" کے معنی ہیں "لوگ" چونکہ لوگوں کو مختلف طبقات یعنی غنی، فقیر، عالم، جاہل، سفید، سیاہ، ظالم و مظلوم وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر ہم صرف نوع انسانی کو سامنے رکھتے ہوئے وجہ اختلاف سے قطع نظر کر لیں اور انسان کو انسان ہی کی حیثیت سے دیکھیں تو پھر "ناس" کے لفظ میں تمام افراد بشر شامل ہوں گے یعنی رنگ، شکل، طبقہ، دین اور طرز فکر سے الگ انسان۔ فلسفہ کی اصطلاح میں اسے "انسان لابشرط" کہا جاتا ہے۔

مفسرین نے قدیم زمانہ سے لفظ "ناس" کے یہی معنی بیان کئے ہیں جو صحیح ہیں۔ مگر کچھ افراد غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ناس" سے مراد

نادار، محروم اور بے چارے لوگ ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے "ناس" کا لفظ ایک خاص گروہ کے ساتھ مختص ہو جاتا ہے، "تمام لوگوں" کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا۔ مگر یہ معنی درست نہیں ہیں۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے قرآن مجید میں ناس سے مراد تمام لوگ ہیں کسی خاص حالت، دین، فقر، تونگری، رنگ، علم سے قطع نظر کرتے ہوئے۔ یہ پھر قرآن مجید نے جو یہ فرمایا ہے "**یا ایہا الناس اعبدوا ربکم**" (بقرہ /۲۱) یعنی اے انسانو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قرآن کریم نے صرف ایک جماعت افراد کو اپنا مخاطب قرار دیا ہے بلکہ قرآن کا خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ نیز آیت مبارکہ "**للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا**" (آل عمران /۹۷)

یعنی اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا واجب ہے اگر اس کی استطاعت رکھتے ہوں، میں اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں پر حج واجب قرار دیا ہے صرف بعض لوگوں پر نہیں، اگرچہ **من استطاع الیہ سبیلا** کی شرط لگا کر اس کو مستطیع افراد سے مشروط فرما دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر لفظ ناس کا اطلاق کفار پر بھی کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران آیت ۱۷۳ میں ارشاد ہے:

"**ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم**"

یعنی ان سے جب بعض لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے لئے عظیم لشکر جمع کر لیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو، تو اس آیت کا تعلق اس واقع کے ساتھ ہے کہ کفار مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا پہلے ہی سے انہوں نے افواہ پھیلا دی کہ لوگ مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے دلوں میں رعب و خوف پیدا کرنا چاہتے تھے۔

اسی زیر بحث آیت میں ناس کا لفظ منافقین کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ "**و من الناس من یقول**" یعنی لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ.....

جنہوں نے "ناس" کو نادار لوگوں کا ایک گروہ قرار دیا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ منافقین اسی گروہ کا ایک حصہ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ

منافقین کا تعلق تو ہر طبقے سے ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے صدر اسلام کے منافقین جن کا ذکر قرآن کریم فرماتا ہے' مدینہ کے امرا میں سے تھے۔ رسول اکرمؐ کے زمانہ میں منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی تھا۔ یہ شخص آنحضرتؐ کی مدینہ آمد سے قبل وہاں کا اس حد تک بااثر و ثروت مند فرد تھا کہ وہاں کے لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے پر اتفاق کر چکے تھے تاکہ اوس و خزرج کے باہمی گہرے اختلافات ختم ہو سکیں۔ وہ اس کی تاجپوشی کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ وہ اپنی بادشاہت مسلم سمجھ رہا تھا' اسلام نے مکہ میں ظہور کیا۔ مدینہ کے جن لوگوں کا مکہ کے ساتھ تعلق تھا انہوں نے رسول اکرمؐ سے ملاقات کی' مسلمان ہوئے اور رسول اکرمؐ سے درخواست کی کہ مدینہ میں کوئی مبلغ بھیجیں۔ رسول اللہؐ نے مصعبؓ بن عمیر کو روانہ کیا۔ مدینہ کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح رسول اللہؐ کے لیے ہجرت مدینہ کا راستہ ہموار ہو گیا اور عبداللہ ابن ابی کی تمام خواہشات پر پانی پھر گیا۔ لہٰذا اس کے دل میں اسلام کے لیے بدترین کینہ پیدا ہو گیا۔ پس جب مدینہ کے تقریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے تو اس کو اسلام کے اظہار کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا لیکن اس نے دل سے کبھی اسلام کو قبول نہ کیا۔ لہٰذا جب مدینہ کے لوگوں کی تقریباً اکثریت نے اسلام قبول کر لیا تو اس بے چارے کے لیے اور کوئی صورت باقی نہ رہی سوائے اس کے کہ بظاہر مسلمان ہو جائے لیکن دل سے کبھی بھی اس نے اسلام کو تسلیم نہ کیا۔

بہر حال یہاں ناس سے مراد نادار لوگ نہیں ہیں۔ اس کی دلیل یہی عبداللہ بن ابی ہے جو ان کا سردار تھا۔ وہ نادار لوگوں میں سے نہیں تھا بلکہ مدینہ کا معزز ترین شخص تھا۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کفار کے بارے میں صرف دو آیات ہیں اور مومنین کے متعلق تین یا چار لیکن جب منافقین کی نوبت آتی ہے تو تقریباً تیرہ آیات میں ان پر بحث کی گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ منافقین سے متعلق آیات میں بعض کا آغاز لفظ الا (خبردار) کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کو متعارف کرانے کو اتنی اہمیت کیوں دی ہے؟ اس سوال کو

مفسرین نے بھی اٹھایا ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کا اس قدر ذکر کیوں کیا ہے؟
عام طور پر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگرچہ منافق کفار ہی کی ایک قسم ہے تاہم جیسا کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے پتہ چلتا ہے' منافق کفار سے زیادہ اسلام کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ کافر یعنی جس کو قرآن کافر کہتا ہے' وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول' اللہ پر ایمان نہ لائے لیکن جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی برملا زبان پر لاتا ہے یعنی کھلے عام خدا و رسول' کا انکار کرتا ہے۔ مسلمان اس کے سلسلے میں اپنے فرض سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس نے اپنے قلبی عقیدہ کو چھپا رکھا ہو یعنی زبان سے کچھ کہے جبکہ اس کے دل میں کچھ اور ہو تو ایسا شخص بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ہی دراصل مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے جبکہ کفار سے مسلمان اس قسم کا دھوکا نہیں کھاتے۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے۔

"ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار" (نساء / ۱۴۵)

یعنی بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔

یہ جو تاریخ میں آتا ہے کہ رسول اللہ' اپنی جنگوں میں فاتح ہوئے جبکہ حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ' کی طرح کامیاب نہ ہو سکے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ رسول اللہ' کا مقابلہ کفار سے تھا جبکہ امیر المومنین' کا منافقین سے تھا۔ یعنی رسول اللہ' کی جنگیں ان لوگوں کے ساتھ تھیں جن کا مسلک و مذہب واضح و صریح تھا۔ جب رسول اللہ' ان سے کلمہ **لا الہ الا اللہ** کہنے کو کہتے تو وہ سب انکار کر دیتے کہ ہم اس کلمہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ جواب میں ابوسفیان **اعل ھبل' اعل ھبل'** کے نعرے لگاتا تھا۔ پیغمبر اکرم' ان کے جواب میں کہتے کہ کہو **اللہ اعلیٰ' واجل'** اس طرح اللہ اور ہبل مقابلہ پر ہوتے۔ نتیجہ واضح تھا یعنی اللہ کی فتح اور ہبل کی شکست۔

دوسری طرف امیر المومنین' کو بھی ابوسفیانیوں کا سامنا تھا لیکن اس وقت یہ لوگ اسلام کا نعرہ لگاتے تھے۔ اگر معاویہ جو ہمیشہ اپنے باپ ابوسفیان کے ہدف کے حصول کے لیے کوشاں رہتا تھا اعلانیہ طور پر **اعل ھبل'** کا نعرہ لگاتا تو لازماً امیر المومنین علیہ السلام سے شکست کھا جاتا۔ لیکن وہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مگرمچھ کے

آنسو بہاتے ہوئے اس ہیں کی بجائے یہ نعرہ لگاتا تھا:

"و من قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا فلا یسرف فی القتل انه کان منصورا (اسراء / ۳۳)

یعنی جو مظلوم قتل ہوتا ہے ہم اس کے ولی کو بدلہ کا اختیار دے دیتے ہیں لیکن اسے بھی چاہیے کہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھ جائے۔

اور لوگوں سے کہتا کہ رسول اللہؐ کا مظلوم خلیفہ عثمان شہید ہو گیا ہے۔ اے لوگو! کیا یہ صحیح ہو گا کہ خلیفہ کا خون رائیگاں چلا جائے؟ اس طرح اس نے لوگوں کو قاتلان عثمان سے انتقام لینے کے لیے جمع کیا اور پھر امیر المومنینؑ کو قاتلین عثمان کے سربراہ کے طور پر متعارف کرایا حالانکہ عثمان کا حقیقی قاتل معاویہ خود ہی ہے۔ نہج البلاغہ میں امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"و انهم لیطلبون حقا هم ترکوه و دما هم سفکوه" ۱۴

یعنی وہ مجھ سے اس حق کا مطالبہ کرتے ہیں جسے خود ہی انہوں نے چھوڑ دیا اور اس خون کا معاوضہ چاہتے ہیں جسے انہوں نے خود بہایا ہے۔

نیز فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ جب عثمان نے مدد طلب کی تو تو نے اس کی مدد کیوں نہ کی؟ تو موقع کی تلاش میں رہا کہ عثمانؓ مارے جائیں اور تو اس سے فائدہ اٹھائے"

معاویہ نے مدینہ میں اپنے جاسوس بھیج رکھے تھے جو عثمان کے گھر کے ارد گرد رہ کر حالات پر نظر رکھے ہوئے تھے تاکہ جونہی عثمان قتل ہو جائیں ان کا خون آلود پیراہن شام پہنچا دیں۔ جاسوسوں نے یہ کام تیزی سے انجام دیا۔ اس پیراہن کو ایک عرصے تک شام کی مسجد میں لٹکایا گیا اور معاویہ گاہے گاہے لوگوں کے سامنے اس پیراہن کے پاس آنسو بہاتا، عثمان کے سوگ میں سر و سینہ پیٹتا۔ اس طرح سادہ لوح مسلمانوں کے جذبات کو اللہ کے نام پر مشتعل کرتا اور وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔

پھر جب صفین کی جنگ میں ایسا مرحلہ آیا جب اسے اپنی شکست کے آثار دکھائی دینے لگے تو اس نے پھر فریب و منافقت سے کام لیتے ہوئے قرآن مجید کو

نیزوں پر بلند کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہم قرآن مجید کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ جانتے تھے کہ یہ اس کی پر فریب چال ہے۔ لہٰذا آپؑ نے فرمایا کہ شمشیر زنی جاری رکھو اور آگے بڑھتے جاؤ۔ لیکن نادان پرہیزگار لوگ جو منافقین کی چالوں سے واقف نہ تھے پکارنے لگے کہ ہم قرآن کریم سے نہیں لڑ سکتے جبکہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قرآن کے خلاف جنگ کریں۔ اس چال سے اموی جماعت نے اپنے آپ کو شکست سے بچا لیا۔

یہ ہے نفاق کا وہ بہت بڑا خطرہ جس سے قرآن کریم نے لفظ الا (خبردار) کے ساتھ مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔ اس طرح اسلام کو جب بھی کفر کا سامنا کرنا پڑا تو اسلام نے اسے شکست دی لیکن جب بھی منافقت سے سامنا پڑا تو اس سے شکست کھائی کیونکہ منافقت نے اسلام ہی کی طاقت سے فائدہ اٹھا کر اسے خود اسلام ہی کے خلاف استعمال کیا یعنی منافقت اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ہی ہمیشہ اسلام سے جنگ آزما ہوئی۔

۳۔ ایک اور نکتہ جس کی نشاندہی ضروری ہے' یہ ہے کہ نفاق کا خطرہ ہمیشہ اسلام کے سر پر منڈلاتا رہا ہے لیکن اس کی صورت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہی بلکہ ہر زمانہ اور ہر دور میں اس نے نیا روپ دھارا ہے۔

ان دنوں ایک کتاب میری نظر سے گزری ہے جسے شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میں جانتا ہوں کہ بعض لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کریم کے نام پر مادہ پرستی کی ترویج کر رہے ہیں اس کتاب کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اللہ کا ذکر اور قرآن پاک کی آیات کو بیان کیا گیا ہے لیکن جب اس میں بیان کردہ مطالب کی نوبت آتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مادیت نے قرآن کا نقاب اوڑھ رکھا ہے یعنی وہ مادیت جس کے متعلق چند سال قبل تک خیال کیا جاتا تھا کہ ایران میں مذہب کا مقابلہ کر سکتی ہے اور پوری توانائی سے اس نے اس مقابلہ کا آغاز کر کے کہا کہ خدا کچھ نہیں' پیغمبرؐ کا دعویٰ غلط ہے' وحی کی کوئی حقیقت نہیں لیکن اس تصور نے مذہب کی مضبوط طاقت سے شکست کھائی۔ اب جبکہ وہ اس حربہ میں ناکام ہو چکے ہیں تو انہی مطالب کو اسلامی تعلیمات

کے رنگ میں پیش کر رہے ہیں یعنی اب ہستی خالق کا اور طریقے سے انکار کرتے ہیں اور قیامت کا ایک اور طریقے سے۔ مثلاً جب قیامت و آخرت کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس سے بہتر نظام مراد ہوتا ہے جبکہ دنیا سے مراد زندگی کا پست تر نظام ہے۔ بالفاظ دیگر ان کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں دنیا کے معنی طاغوتی نظام ہیں۔ لہٰذا اگر موجودہ نظام بدل جائے تو آنے والا نظام آخرت کا نظام کہلائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ بات تو درست ہے مگر اس سے ان کا مقصود باطل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں پست نظام کار فرما ہے جس کا مقابلہ ضروری ہے اور اس کی جگہ برتر نظام کو بروئے کار لانا چاہیے۔ قرآن کریم میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کریم میں دنیا و آخرت سے مراد ہرگز پست تر یا برتر نظام نہیں بلکہ دنیا و آخرت کا اپنا الگ مفہوم ہے۔ اور پست تر یا برتر نظام کا مفہوم الگ ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مادہ پرست لوگ اب یہ نہیں کہتے کہ آخرت کا نظریہ بے بنیاد ہے۔ یہ لوگ عالم آخرت میں انسان کی ابدیت کا انکار نہیں کرتے بلکہ ابدیت کی تاویل اس طرح سے کرتے ہیں اور یہی مادہ پرستوں کا معروف نظریہ ہے جو انہوں نے تکامل کی تاویل کے سلسلے میں اپنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک فرد دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب وہ اٹھ جاتا ہے تو تیسرا شخص اس کی جگہ پر آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس طرح جاری رہتا ہے۔ یعنی نوع ہر حالت میں باقی رہتی ہے اور یہی ابدیت کے معنی ہیں۔

درحقیقت یہ وہی معاویہ کا نیزوں پر قرآن بلند کرنا ہے جس نے اب شکل بدل لی ہے۔ نفاق ہر دور میں نیا روپ دھارتا ہے مسلمان آگہی سے تہی داماں ہیں اس لیے چودہ سو سال سے نیزوں پر قرآن کے بلند کیے جانے کے دھوکے میں آرہے ہیں۔ جب بھی کوئی دشمن دین جماعت وجود میں آتی ہے تو وہ دین کی آڑ لے کر دین کی مخالفت کرنے میں کامیاب رہتی ہے۔ اگر مسلمان آگاہ اور بیدار ہوں تو منافقین کے تمام ناپاک عزائم خاک میں مل جائیں۔ ان کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"اولئک الذین اشتروا و الضلالۃ بالھدیٰ فما ربحت تجارتھم

وما کانوا مھتدین" یعنی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے جس تجارت سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اس میں کسی طرح کی ہدایت ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک سودا کیا لیکن یہ کس قدر گھاٹے کا سودا ہے ہدایت کو ہاتھ سے دیا اور گمراہی خرید لی۔ اس سودے میں ان کو نہ صرف کوئی نفع نہ ملا بلکہ دراصل وہ بہت گھاٹے میں رہے۔ ان کو کوئی راستہ نظر نہ آیا اور نتیجہ" گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہیں۔

امام علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ عقل کیا ہے؟

فرمایا: "**العقل ماعبدبه الرحمٰن واکتسب به الجنان۔**"

عقل اس شے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی کی جانب انسان کی راہنمائی کرتی اور اسے ابدی سعادت سے ہمکنار کرتی ہے۔

سوال کرنے والے نے پوچھا کہ پھر معاویہ کے پاس کیا چیز تھی۔

فرمایا: "**تلک النکری و الشیطنة**" یعنی وہ نکری اور شیطنت تھی۔

نکری و شیطنت الگ چیز کا نام ہے اور عقل دوسری شے کا نام ہے۔

نکری و شیطنت سے امام علیہ السلام کی مراد ایسی چالیں ہیں جو دھوکا دہی اور منافقت پر مبنی ہوں اور عقل سے مراد وہ قوت ہے جو معنویت اور انسانیت کی جانب انسان کی ہدایت کرے۔

مثلھم کمثل الذی استوقد نارا فلما اضاء ت ماحوله ذھب اللہ بنورھم و ترکھم فی ظلمات لا یبصرون ○ صم بکم عمی فھم لا یرجعون او کصیب من السماء فیه ظلمات و رعد و برق یجعلون اصابعھم فی آذانھم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط بالکافرین یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیه و اذا اظلم علیھم قاموا و لو شاء اللہ لذھب بسمعھم و ابصارھم ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر ○

یعنی ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے روشنی کے لیے آگ بھڑکائی اور جب ہر طرف روشنی پھیل گئی تو اللہ نے اس کے نور کو سلب کر لیا اور اب

اسے اندھیرے میں کچھ سوجھتا بھی نہیں ہے۔ یہ سب بہرے گونگے اور اندھے ہو گئے ہیں اور اب پلٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔ ان کی دوسری مثال آسمان کی اس بارش کی ہے جس میں تاریکیاں اور گرج چمک سب کچھ ہو جس کے سامنے وہ موت کے خوف سے کڑک دیکھ کر کانوں میں انگلیاں رکھ لیں حالانکہ اللہ کافروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دے کہ جب وہ چمکے تو چل پڑیں اور جب اندھیرا ہو جائے تو پھر ٹھہر جائیں۔ خدا چاہے تو ان کی سماعت و بصارت کو بھی ختم کر سکتا ہے کہ وہ ہر شے پر قدرت و اختیار رکھنے والا ہے۔

قرآن کریم نے منافقوں کے مکر و فریب کو بے اثر کرنے' ان کے تمام منصوبوں کو ناکام قرار دینے اور یہ بتانے کے بعد کہ یہ لوگوں کو دھوکا دینے کی بجائے خود دھوکا کھاتے ہیں اب اس قسم کے مکر و فریب کی دو مثالیں بیان کی ہیں۔ جن کے ذریعے ہمیں "فلسفہ تاریخ" کے بہت ہی زیادہ اہمیت کے حامل ایک نکتہ کے متعلق قرآنی نقطہ نظر کا پتہ چلتا ہے جسے اسلامی نظریہ کائنات اور قرآنی فکر کا اہم اصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہمارے نزدیک یہ ایک بنیادی اور بہت اہم بحث ہے اس لیے ہم ان آیتوں کی تفسیر تفصیل سے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

کائنات کے بارے میں مجموعی طور پر' نیز انسان اور انسانی معاشرہ کے بارے میں اس کے آغاز سے لے کر ہمیشہ تک کے لیے خیر و شر کے اعتبار سے خوبی و بدی' حق و باطل یعنی کیا کائنات کا وجود حق و خیر ہے یا ہیچ و باطل اور شر ہے یا ان سب کا مرکب ہے یعنی آدھا حق و خیر اور آدھا باطل و شر ہے؟ نیز یہ کہ کیا انسان کی زندگی پر خیر حکم فرما ہے یا شر' حق ہے یا باطل یا خیر و شر کا مرکب ہے اگر ہم دونوں کے قائل ہو جائیں تو پھر اصالت کس کی ہو گی؟ کیا اصالت حق کی ہے یا باطل کی؟ اس اعتبار سے مختلف نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

ہم اس سلسلہ میں پہلے فلاسفہ' مفکرین اور سوشیالوجسٹوں کے نظریات کا ذکر کریں گے پھر قرآن کریم کے توحیدی تصور کو بیان کریں گے۔

کوئی شک نہیں کہ انسان کی زندگی کسی حد تک ایک مرکب ہے یعنی اس کی

زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی' اس میں شر بھی ہے اور خیر بھی' عدل بھی ہے اور ظلم بھی' صداقت بھی ہے اور فریب و دھوکا بھی۔ الغرض انسان کی زندگی دو صفات رکھتی ہے ایک نورانی ہے اور دوسرا تاریک۔

نور و ظلمت اور عدل و ظلم کا یہ امتزاج اتنا بڑا ہے کہ روئے زمین پر انسان کی آفرینش سے پہلے ملکوت اعلیٰ ہی میں اس کا وجود زیر بحث آچکا تھا۔ اس سلسلہ میں دو طرح کے نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: **"انی جاعل فی الارض خلیفۃ"** (بقرہ / ۳۰) یعنی میں زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں تو ملکوت کے رہنے والوں کی آواز بلند ہوئی کہ بار الہا! اس میں کیا مصلحت ہے کہ تو فساد اور خون ریزی کرنے والی مخلوق کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے؟ عرض کرتے ہیں:

"قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک" (بقرہ / ۳۰)

یعنی انہوں نے کہا کہ اسے مقرر فرمائے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا جب کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔

فرشتے جو انسان کو صرف شرپسند مخلوق سمجھتے تھے ان کے سامنے انسانی زندگی کا صرف ایک ہی رخ تھا' یعنی وہ اسے صرف خون بہانے والے کے طور پر ہی جانتے تھے۔ فرشتوں نے اگر اعتراض نہ کہا جائے' تو کم از کم سوال ہی کر دیا کہ بار الہا ایسی مخلوق کو خلق کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس امر کی اپنی ایک حیثیت ہے کہ انسان ایسی مخلوق ہے کہ فرشتے بھی اس کے وجود کے تمام رموز کو نہ جان سکے۔ صرف اس کا خالق ہی اس کے وجود کے تمام رموز سے آگاہ ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس نظریہ کو قبول نہ فرمایا اور ان کی تائید نہ کی بلکہ فرمایا۔ **"انی اعلم ما لا تعلمون"** (بقرہ / ۳۰) یعنی میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ یہ تمہاری بدگمانی ہے جبکہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ لہذا انسان کو خلق کرنے کے فوراً بعد ایک امتحان و آزمائش کے ذریعے

فرشتوں پر ثابت کر دیا کہ وہ بہت سخت غلطی کا شکار ہیں۔

فلاسفہ اور مفکرین بھی اس مسئلے میں برابر بحث کرتے اور اپنے نظریات پیش کرتے آئے ہیں۔

اکثر مادہ پرست فلاسفہ جو فطرت کے بارے میں بدگمانیاں رکھتے ہیں چونکہ معتقد نہیں ہیں کہ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ انسان اتفاقی طور پر وجود میں آگیا ہے لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ شر انسان کی ذات کا ایک حصہ ہے اس نے زمین پر قدم رکھتے ہی شرانگیزی شروع کر دی تھی' اب بھی یہ شرانگیز ہی ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا اس کی سعادت کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ فلاسفہ معاشرہ کے لیے ہر طرح کے اصلاحی لائحہ عمل کو مسترد کرتے ہوئے۔ انسان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں رکھتے کیونکہ یہ بنیادی طور پر انسان کو ناقابل اصلاح قرار دیتے ہیں۔ انسان کی اصلاح کے نام پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے چاہے دین کی طرف سے ہو' فلاسفہ اس سب کے بارے میں بدگمان ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب ظاہر سازی ہے۔ چونکہ اصلاح کے لیے منصوبے تیار کرنے والے خود انسان تھے اس لیے ان میں مختلف غرائز تھے اور انسانی غرائز سے فقط شر ہی جنم لیتا ہے۔ اس طرح یہ فلاسفہ ہر طرح کے اصلاحی و اخلاقی نظریات اور معاشرتی تجاویز کو فضول قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ پھر کس امید پر زندہ رہنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں کہ اسے زندہ تو رہنا ہی نہیں چاہیے۔ ان کے خیال میں اگر بشر کمال کی آخری حد تک پہنچ جائے تو اسے خودکشی کر لینی چاہیے۔ انسان کی ترقی کی معراج یہ ہے کہ وہ اس مرحلہ تک پہنچ جائے اور اسے اس بات کا ادراک ہو جائے کہ وہ شر کے علاوہ کچھ نہیں ہے' اس کا مستقبل بھی شر ہی ہے' گویا جتنے زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گا اس کے شر میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا تو اس حالت میں انسان ان کے بقول' "فکری بلوغت" کے مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے جہاں اسے خودکشی کر لینی چاہیے۔

اس موضوع پر بہت زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں ان کو متعارف کرانا نہیں چاہتا۔ اجمالی طور پر صرف یہ بتائے دیتا ہوں کہ دنیا میں ایسے فلاسفہ بھی تھے

جنہوں نے آخر کار خود کشی کی۔ یہ سب کے سب مادہ پرست تھے اور "بدگمان فلاسفہ" کے طور پر مشہور ہیں۔ یورپ میں بھی اسی فکر کے پیروکار لکھنے والے موجود ہیں جنہوں نے اس سلسلہ میں متعدد مقالات تحریر کئے ہیں۔

ایران میں بھی یہ تلخ زہر ہمارے دور میں بعض اہل قلم نے اپنی تحریروں میں گھولا ہے۔ "صادق ہدایت" انہی میں سے ہے۔ وہ ابھی جوان ہی تھا کہ اس نے ۱۳۲۰ھ شمسی میں اسی فکر سے متاثر ہو کر خود کشی کر لی۔ وہ اپنی تحریروں میں اس بات پر فخر کرتا تھا کہ وہ فکری بلوغ کے اس مرحلے پر پہنچ چکا ہے جہاں خود کشی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اور کہتا تھا کہ دوسروں کو بھی اس کی پیروی کرتے ہوئے خود کشی کر لینی چاہیے۔

اس سے مستزاد یہ ہے کہ ایسے افراد کا کہنا ہے کہ انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہوگی کہ اگر ممکن ہو تو انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہئے۔ یعنی مثلاً ایک بم کے ذریعے تمام انسانوں کو نابود کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر بہت ہی غلط اور احمقانہ ہے۔

مادہ پرستوں کا ایک اور نظریہ بھی ہے۔ ہرچند وہ بھی بدگمانی پر مبنی ہے تاہم مذکورہ طریقے سے اپنی بدگمانی کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ایک اور طرح اس کی تاویل کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "انسان میں کوئی فطری رجحان نہیں پایا جاتا بلکہ وہ اسی طریق کار کے تابع رہتا ہے جو اس کو دیا جائے۔ تاریخ و معاشرہ کی مادی ماہیت کے قائلین کہتے ہیں کہ مادی و معاشرتی تعلقات نیز اقتصادی اور پیداواری تعلقات ہی انسانی زندگی پر مطلقاً مسلط ہیں۔ یہ تعلقات جس شکل میں بھی ہوں انسان کی زندگی نیکی اور بدی کے اعتبار سے انہی کے تابع ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی کے متعلق نہ تو خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہیے اور نہ بدگمانی میں۔ کیونکہ پیداواری تعلق کبھی انسان کو جبراً اچھا بنا دیتا ہے کبھی برا۔

ان کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب پیداوار کی سطح اور آلات اپنی ابتدائی حالت میں تھے۔ انسان اپنی روزمرہ کی ضروریات سے زائد خوراک جمع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا طرز زندگی جانوروں سے مشابہ تھا۔ مثلاً کبوتروں کی مانند جو

صبح کے وقت اپنے آشیانوں سے باہر آتے ہیں' رات تک کھاتے پیتے رہتے ہیں اور پھر اپنے آشیانوں کو لوٹ آتے ہیں۔ اگلے روز پھر یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ پہلے زمانہ کا انسان بھی اس طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ خوراک کو ذخیرہ نہیں کرتا تھا اور دولت نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہ تھی۔ معاشرہ کے افراد مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے اور عموماً خوراک بھی مل جل کر ہی حاصل کرتے تھے۔ مثلاً اکیلا انسان کسی جانور کو شکار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس ایسے آلات کافی نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا چند افراد مل کر کسی بڑے جانور کو شکار کرتے اور اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ ایسے حالات میں انسان مجبوراً بھائیوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے کیونکہ زندگی بسر کرنے کے تقاضے ہی ایسے تھے بالکل جس طرح پرندوں کا جھنڈ مل جل کر زندگی گزارتا ہے' قدیم انسان آپس میں جنگ و جدل نہیں کرتا تھا نہ ہی ایک دوسرے کا خون بہاتا تھا۔

آہستہ آہستہ جب انسان کے تجربات میں اضافہ ہوا اور اس نے زراعت کا ہنر سیکھا' اسے مویشی پالنے اور ان کی افزائش کے فوائد کا تجربہ ہوا تو وہ خوراک جمع کرنے کے قابل ہو گیا۔ پھر وہ گندم کا بیج بو کر اس سے مثلاً بیس گنا زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگ گیا اور اس طرح ایک شخص دس اشخاص جتنی پیداوار حاصل کرنے کے قابل ہو گیا۔

جونہی انسان اپنی ضرورت سے زیادہ خوراک حاصل کرنے اور اسے ذخیرہ کرنے کے قابل ہو گیا تو سابقہ نظام درہم برہم ہو گیا اور نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ سابقہ حالات میں ہر شخص کام کرنے پر مجبور تھا' کام کر کے ہی اس کو کھانے کے لیے کچھ مل سکتا تھا۔ اگر وہ کام نہ کرتا تو اس کو کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ لیکن نئے حالات میں جب ایک شخص اپنی ضرورت سے زیادہ کام کرنے کے قابل ہو گیا تو جن افراد میں زیادہ قوت ہوتی وہ دوسروں کو اپنا غلام بنا لیتے' اب غلام کام کرتے اور یہ لوگ کھاتے۔ یہیں سے ملکیت یعنی زمین کی ملکیت اور پھر انسان پر انسان کی ملکیت کا آغاز ہوا۔

پس جب پیداوار کے حالات اور طریق کار بدل گئے تو انسانی معاشرہ بھی نہ

و بالا ہو گیا اور سابقہ زمانہ میں برادرانہ زندگی بسر کرنے والے افراد ایک دوسرے کے دشمن بن کر ایک دوسرے کے سامنے آنے لگے۔ لہٰذا ابتدائے آفرینش کی روشنی اور نیکی غروب ہو گئیں' تاریکی نے پوری انسانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا' اس دن سے زندگی میں ظلمت نور پر' شر خیر پر' ظلم عدل پر' فریب و دھوکا سچائی پر غالب ہیں۔ اس دوران کبھی کبھی روشنی کی ایک کرن بطور استثنائی نظر آجاتی ہے' مثلاً کوئی فلسفی یا کسی تحریک کا قائد پیدا ہوتا ہے جو ظلمت کے دباؤ سے تنگ آکر آواز بلند کرتا ہے یا یہ کہ جو لوگ دین سے بہت زیادہ بدگمان نہیں تھے ان کے مطابق کوئی پیغمبرؑ مبعوث ہو جاتا ہے۔ جس سے کچھ عرصہ تک معاشرے میں عدل و نیکی جگہ لے لیتے ہیں۔ لیکن چونکہ تاریخ پر نظام ملکیت و دولت مسلط ہے اس لیے عدل و نیکی کی حکمرانی کبھی بھی اپنا وجود مسلسل برقرار نہیں رکھ سکی بلکہ تاریکی میں چمکنے والی روشنی کی مانند ایک لمحہ کے بعد ہی ناپید ہو جاتی ہے۔ پھر یہی اصلاحی لائحہ عمل اہل ثروت کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے جس کو وہ مظلوموں کے خلاف استعمال کرتے ہیں یعنی جو چیز مظلوموں کو اپنی راحت و آسائش کا ذریعہ معلوم ہوتی وہی بعد میں ان کے لیے بلائے جان بن جاتی ہے۔ الغرض کسی بھی مصلح کے پیش کردہ ہر مذہب' ہر فلسفے اور ہر اخلاقی منشور کا یہی انجام ہوا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ جاری رہتی ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی دن بنیاد یعنی پیداواری تعلقات میں خود بخود جبراً کوئی تبدیلی رونما ہو جائے۔ یعنی ایک زمانہ وہ تھا جب انسان اس بنیاد کے ناقص ہونے کے باعث اشتراکی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا جس کے نتیجے میں جب انسان مذکورہ بنیاد رشد سے ہمکنار ہو گیا اور متعلقہ انتظامات کامل ہو گئے تو انسان خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اسے مجبوراً اشتراکی زندگی گزارنا ہو گی یعنی پھر وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اشتراکیت کے علاوہ کوئی دوسرا طرز زندگی اپنا ہی نہیں سکتا۔ اس کی مرضی کو اس معاملے میں کوئی دخل نہیں کیونکہ پیداواری آلات کی ترقی اشتراکی طرز زندگی کو جبراً وجود میں لے آتی ہے۔ اس وقت انسانی معاشرے میں دوبارہ نور و عدل' نیکی و خلوص اور محبت و برادری لوٹ آئے گی۔ ان مفکرین کے نزدیک یہی سوشلزم کی

آخری شکل اور کمیونزم ہے۔

پس فلاسفہ کی جماعت مادہ پرستوں کی پہلی جماعت کی مانند یہ نہیں کہتی کہ انسانی فطرت کی بنیاد ہی شر پر استوار ہے اور رہے گی بلکہ دائی ہے کہ انسان کی بذات خود کوئی فطرت ہے ہی نہیں' وہ تو اپنے پیداواری آلات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ شروع میں پیداواری آلات ایسے تھے کہ انسان کو مجبوراً نیک رہنا پڑتا تھا۔ پھر پیداواری آلات تبدیل ہو گئے تو ثروت و ملکیت نے جنم لیا اور انسان بدتر ہو گیا۔ لہٰذا جب تک ملکیت و ثروت کا دور دورہ ہے انسان کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اگر انسان کہتا ہے کہ میں اصلاح کرنا چاہتا ہوں تو وہ غلطی پر ہے اور یہ اس کے گمان سے آگے کچھ نہیں جسے "خیالی سوشلزم" کہتے ہیں۔ حقیقی اصلاح کے لیے اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب پیداواری آلات کے نتیجے میں وجود میں آنے والی ملکیت کا خاتمہ ہو گا اس دن ہی انسانی معاشرہ میں اخوت' عدالت روشنی اور نیکی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم کا نظریہ

اب ہم قرآن کریم کی جانب رجوع کرتے اور دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں اس کا نظریہ کیا ہے! تاریخ کی تشریح کے حوالے سے قرآن کریم کا یہ اہم ترین مسئلہ ہے۔ کیا قرآن کریم بشر و حیات بشر کو خوش فہمی کی نظر سے دیکھتا ہے اور دائی ہے کہ شر کا ازل سے وجود ہی نہیں تھا' نہ ہے اور نہ کبھی ہو گا؟ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا یہ نظریہ نہیں ہے اور اس کو زیر بحث لانے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ قرآن کریم طول تاریخ میں حق و باطل کے درمیان معرکہ کا قائل ہے۔ لہٰذا قرآن باطل کے وجود کو تسلیم کرتا ہے' یعنی وہ نور و ظلمت کو ایک دوسرے کے مقابل قرار دیتا ہے' جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قرآن حکیم تخلیق آدمؑ کے واقعہ کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ فرشتوں نے جب یہ گمان ظاہر کیا کہ آدم شر محض ہے اور اسی بارے میں اعتراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ تمہارا گمان تھا" غلط ہے بلکہ فرمایا کہ

جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے یعنی جو تم جانتے ہو وہ بھی درست ہے میں اسے بھی جانتا ہوں لیکن پھر بھی میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ تم نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھا ہے دوسرا نہیں۔ پس یہ بات مسلم ہے کہ قرآن کریم کا نظریہ ایسا نہیں۔

کیا قرآن کے نزدیک انسان شر محض ہے؟ یعنی کیا قرآن پاک کا نظریہ بھی نطشے اور شوپنہاور جیسے افراد کے نظریہ کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ انسان ناقابل اصلاح مخلوق ہے لہٰذا اس کی اصلاح کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہیے؟ یہ بات ہرگز پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی کیونکہ انبیائے کرامؑ کی ذمہ داری مجموعی طور پر انسانی معاشرے کی اصلاح تھی اور اگر وہ فطرت انسانی کے بارے میں اس قدر مایوس ہوتے تو اصلاحی نصب العین پیش ہی نہ کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ نظریہ قرآن کریم کے بنیادی اصول یعنی توحید سے بھی مطابقت نہیں رکھتا یعنی توحیدی نظریہ کائنات کا یہ نہیں ہے اور ممکن ہی نہیں کہ کوئی نظریہ کائنات توحیدی والٰہی ہو مگر اس کے باوجود وہ حیات انسانی کو باطل' بے اصول و شر پر مبنی قرار دے

قرآن مجید جیسا کہ محسوس و مشہود بھی یہی ہے' نظام تخلیق کو نظام خیر قرار دیتا ہے یعنی قرآن کریم اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہ کائنات خیر بھی ہے اور شر بھی' وہ شر پر خیر کے مقدم ہونے اور باطل پر حق کے مقدم ہونے کا قائل ہے۔ اسلامی نظریہ کائنات اس کے علاوہ کسی فکر کی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن کیا کہتا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن کا نظریہ کیا ہے؟

قرآن کریم کا نظریہ مارکسزم کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ طول تاریخ میں حق و باطل ہمیشہ موجود رہے ہیں' ان میں نزاع کی بنیاد انسانی فطرت ہے کیونکہ انسان ایسی مخلوق ہے جس کی فطرت و سرشت کے دو پہلو ہیں۔ احادیث و روایات میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں شہوت و عقل کو مرکب فرما دیا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک طول تاریخ میں ہمیشہ خیر ہی کو غلبہ حاصل رہا ہے' عدل و نور کو بقا حاصل رہی ہے جبکہ ظلمت و شر عارضی طور پر سامنے آتے رہے ہیں۔ قرآن مجید مارکس کی مانند مالکیت کو معیار قرار نہیں دیتا بلکہ وہ ایمان اور روح و

فطرت کی اصالت کا قائل ہے، یعنی قرآن یہ نہیں کہتا کہ دین، مذہب اور اخلاق ہمیشہ سے دولت و ثروت کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہے ہیں۔ وہ اس نظریہ کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ البتہ کبھی کبھار دولت و ثروت مذہب پر اثر انداز ہو کر بدعت و تحریف پیدا کر دیتی ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں مذہب مضبوط و طاقتور عامل کی حیثیت سے انسانی تقدیر میں موثر رہا ہے۔

اصالت حق کی ہے

قرآن کریم کی نظر میں شر و باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ یہ حق کے طفیل پیدا ہونے والی اضافی چیزیں ہیں، مثلاً سایہ و روشنی یا تاریکی و نور۔ یہ دونوں لازم ہیں۔ لیکن نور کے مقابلہ میں ظلمت کو اصالت حاصل نہیں۔ یعنی یہ دو ایسی حقیقتیں نہیں ہیں جن کا الگ الگ سرچشمہ ہو، ایک نور ہو دوسری ظلمت۔ بلکہ اصل حقیقت تو نور ہی ہے اور جہاں نور نہیں وہاں ظلمت ہے۔ نہ ہی ایسا ہے کہ جہاں نور نہ ہو وہاں کوئی اور چیز ہو جو نور کی ضد کہلائے۔ ظلمت دراصل نور کے نہ ہونے ہی کا نام ہے۔

اس کی مثال صحت و بیماری کی مثال ہے۔ یعنی انسانی بدن تب ہی سالم رہ سکتا ہے جب اس میں توازن پایا جائے مثلاً خون کے سفید گلوبیول اپنی معین مقدار سے نہ زیادہ ہوں نہ کم۔ یہی معاملہ خون کے سرخ گلوبیول اور دوران خون کا ہے۔ مرض عدم صحت کا نام ہے۔ بدن میں اصالت توازن و سلامتی کو حاصل ہے۔ اگر طبیعت کے عدم توازن کی بنا پر مرض لاحق ہو جائے تو آخر کار وہ پہلی حالت کی جانب جو صحت مندی سے عبارت ہے لوٹ جائے گا۔ جس طرح بدن اعتدال و صحت کا محتاج ہے اسی طرح انسانی معاشرہ بھی صداقت و امانت اور ایمان و پاکدامنی کا محتاج ہے۔ معاشرہ ان کے مفاہیم سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اگر ان سے خالی ہو جائے تو اس کو دوام ممکن نہیں۔ اگر صرف چند روز کے لیے ہی ظلم و ستم اور بدامنی و بے غیرتی کو غلبہ حاصل ہو جائے تو چونکہ نیکی و نور ہی اصل حیات ہیں اور ظلمت و شر عارضی ہیں لہٰذا معاشرہ جلد ہی فطرت اولیہ کی طرف لوٹ جائے گا۔

الغرض قرآن کریم کے نظریہ کا خلاصہ چند نکات پر مبنی ہے:

۱۔ کائنات میں باطل کو اصالت حاصل نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق کے طفیل وجود میں آتا ہے۔

۲۔ باطل چونکہ طفیلی ہوتا ہے اس لئے اسے دوام بھی حاصل نہیں ہوتا دوام فقط حق کو حاصل ہے اور یہی اس کی دلیل ہے۔

۳۔ باطل کو نہ اصالت حاصل ہے نہ دوام۔ لیکن اس کے باوجود اس کو قابل غور ظاہری وسعت حاصل ہے اگر انسان حقیقت بین نہ ہو تو کہنے لگے گا کہ باطل کو اصالت حاصل ہے اور باطل کے مقابلے میں حق حقیر ہے۔

یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ باطل ایک طفیلی و غیر اصیل امر کے سوا کچھ نہیں اور طفیلی و غیر اصیل ہونے کے باعث جھاگ کی مانند مٹ جانے والا ہے مگر اس کے باوجود جب ظاہر ہوتا ہے تو اس کا پھیلاؤ اتنا زیادہ اور نمایاں ہوتا ہے اور اس حد تک جاذب توجہ ہوتا ہے کہ اگر انسان بنظر غائر نہ دیکھے تو کہے گا کہ بس باطل ہی سب کچھ ہے' حق کہاں ہے؟ یہی وہ غلط فہمی ہے لوگ جس کے عموماً مرتکب ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان کی نظر گہرائی کی حامل نہیں لہذا وہ کہتا ہے کہ اگر دنیا میں کبھی حق کا ظہور ہوا بھی ہے تو وہ بجلی کی چمک کی مانند تھا جو چمکی اور فوراً غائب ہو گئی۔ اس کے علاوہ دنیا میں ہمیشہ باطل ہی کی حکومت رہی ہے۔ در حقیقت یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اصالت تو حق ہی کو حاصل ہے اور باطل نے اپنی قوت حق ہی سے حاصل کی ہے باطل تو حق کے طفیل ہے لیکن اس نے حق کا چہرہ چھپا رکھا ہے۔

قرآن مجید نے حق و باطل کی کشمکش اور اس کے انجام کا ذکر متعدد آیات میں فرمایا ہے اور اس کی چند مثالیں بھی بیان کی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کو یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ سورہ رعد آیت ۱۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

"و انزل من السماء ماء فسالت اودیة بقدرها فاحتمل السیل زبدا رابیا و مما یوقدون علیه فی النار ابتغاء حلیة او متاع زبد مثله کذلک

یضرب اللہ الحق و الباطل۔ فاما الزبد فیذھب جفاءا و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال"

یعنی اس نے آسمان سے پانی برسایا تو وادیوں میں بقدر ظرف بہنے لگا اور سیلاب ہیں جوش کھا کر جھاگ آگیا اور اس دھات سے بھی جھاگ پیدا ہو گیا جسے آگ پر زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔ اس طرح پروردگار حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے کہ جھاگ خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی شے زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اوپر سے پانی برساتا ہے۔ (بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس پانی سے مراد پاک و صاف پانی ہے۔) بارش کا یہ پاک و صاف پانی چٹانوں اور پہاڑوں پر برستا ہے پھر وادیوں' دروں اور دریاؤں میں بہنے لگتا ہے اس طرح کثافتوں کو اپنے ساتھ بہا لے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ سیلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ پانی اپنی روانی کے دوران پتھروں اور کثافتوں کے ساتھ ٹکراتا ہے اس قدر جھاگ پیدا کرتا ہے کہ حقیقت حال سے بے خبر انسان جب اس کو عظیم دریا کی صورت میں دیکھتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی جھاگ ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ سب کچھ پانی ہی ہے یعنی بنیاد پانی ہے جس نے قوت و حرکت پیدا کر کے جھاگ پیدا کیا ہے۔ جھاگ اگرچہ موجود ہے مگر اس کا وجود پانی ہی کے باعث ہے۔ فرق یہ ہے کہ جھاگ اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس نے پانی کو چھپا رکھا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"و مما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ"

یعنی اور اس دھات سے بھی جھاگ پیدا ہوتا ہے جسے آگ پر زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔

اس کی مثال دھات کے پگھلانے کی ہے کہ جب زیور بنانے کے لیے کسی دھات کو پگھلاتے ہیں تو ایسی ہی صورت حال پیدا ہوتی ہے یعنی اس کے اوپر جھاگ نمودار ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"كذلك يضرب الله الحق والباطل"

یعنی اس طرح اللہ تعالیٰ حق و باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔

یہ حق و باطل کی مثال ہے یا بعض مفسرین کے بقول حق و باطل کا اس طرح ظہور ہوتا ہے یعنی حق کا وجود پاک و صاف پانی اور قیمتی دھات کی مانند ہے جبکہ باطل کا وجود پانی کے اوپر والی جھاگ جیسا ہے۔

"فاما الزبد فیذهب جفاء"

یعنی زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ جھاگ نابود ہو جاتا ہے۔

"فاما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض"

یعنی جو شے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی ہے وہ باقی رہ جاتی ہے۔

بالفاظ دیگر لوگوں کے فائدے کی چیز یعنی حق باقی رہ جاتا ہے۔ دریا میں جھاگ کے نیچے جو پانی رواں ہوتا ہے وہ کھیتوں اور زمینوں کو سیراب کرتا ہے جس کے اچھے نتائج رونما ہوتے ہیں۔ اسی طرح قیمتی دھات باقی رہ جاتی ہے اور آلات یا زیورات کی شکل اختیار کر لیتی ہے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

۲۔ سورۂ ابراہیم آیات ۲۴ تا ۲۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

"الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء توتی اکلها کل حین باذن ربها و یضرب الله الامثال للناس لعلهم یتذکرون و مثل کلمة خبیثة کشجرة خبیثة اجتثت من فوق الارض مالها من قرار"

یعنی کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح کلمہ طیبہ کی مثال شجرہ طیبہ سے بیان فرمائی ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہ شجر ہر زمانہ میں حکم پروردگار سے پھل دیتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے کہ شاید اس طرح وہ ہوش میں آجائیں اسی طرح کلمہ خبیثہ کی مثال شجرہ خبیثہ کی ہے جسے زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے اور اس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔

قرآن کریم میں لفظ "کلمہ" بعض مقامات پر "لفظ" کے معنی میں آیا ہے

ور بعض مقامات پر "حقائق" کے معنی میں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں حق و باطل دونوں عقائد کو لفظ "کلمہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور ہر ایک کے لیے ایک مثال بھی بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کلمہ حق کی مثال ایک تندرست اور پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین کے اندر گہری ہیں اور شاخیں اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ یہ پتوں والا پھلدار درخت ہے جس کا پھل کسی خاص موسم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ ایسا درخت ہے جس پر ہر موسم میں پھل آتا ہے یعنی یہ سدا بہار ہے۔ **"تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا"** یعنی یہ ایسا درخت ہے جس کا پھل جتنا زیادہ چنا جائے اتنا ہی اس پر پھل لگتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس باطل عقیدہ کی مثال ایک ناپاک درخت کی ہے جس پر نہ پھل لگتا ہے نہ اس کی جڑیں ہوتی ہیں۔

بعض اوقات بعض مقامات پر ایسے پودے اگ آتے ہیں جن پر پھل نہیں لگتا۔ جب ہم بغور ان کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی جڑیں ہی نہیں ہیں لہٰذا ان کی بنیاد بہت کمزور ہوتی ہے۔ جونہی معمولی سی ہوا چلتی ہے یہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر دور جا گرتے ہیں۔ یہ گذشتہ آیت میں بیان ہونے والی جھاگ کی مانند ہے جس کی نمود تو بہت ہوتی ہے لیکن اس کا ثبات بہت کم ہوتا ہے۔

ناصر خسرو نے کدو کی بیل اور چنار کے درخت کے مابین ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ چنار کے درخت کے نیچے کدو کی ایک بیل اگی جس نے بڑی تیزی سے نشوونما پائی اور چنار کے سارے درخت پر پھیل گئی چنار کے درخت کی عمر تیس سال کی ہو گی جبکہ کدو کی بیل بیس روز میں چنار کے درخت سے اونچی ہو گئی اور چنار کے درخت سے کہنے لگی کہ تیری عمر کتنی ہے؟ چنار نے جواب دیا کہ میری عمر تیس سال سے زیادہ ہے۔ کدو کی بیل نے ہنس کر طعنہ دیا اور کہا کہ مجھے دیکھو میں بیس دن کے اندر تم سے آگے نکل چکی ہوں۔ چنار نے جواب دیا۔

بگذار بر من و تو وزد باد مہرگان
آنگہ شود پدید کہ نامرد و مرد کیست

ٹھہر جا! ذرا موسم خزاں آنے اور تیز ہوائیں چلنے دے پھر پتہ چلے گا کہ ہم میں سے کون ثابت قدم رہ سکتا ہے۔

الغرض قرآن مجید کہتا ہے کہ ظاہر بین نہ بنو۔ باطل اپنی کثرت نمود کی بنا پر تمہیں دھوکا نہ دے بلکہ تمہیں بنظر غائر دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ باطل مکتب فکر جس کی کل عمر بیس یا تیس سال سے زیادہ نہ ہو ایک دم اس قدر پھیل جائے کہ بظاہر اس کی نمود مبنی بر حق مذہب سے زیادہ ہو جس کی عمر چودہ سو سال سے زیادہ ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ باد مخالف کا انتظار کرنا چاہیے۔ اسلامی انقلاب کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں اس کے خلاف کیا کیا تیز آندھیاں چلیں لیکن یہ اپنی جگہ پر قائم رہا جبکہ اس قسم کے مکاتب فکر ہیں جو نشیب و فراز سے دو چار ہو کر مٹ جاتے ہیں۔

۳۔ سورۂ انبیاء آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

"بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق و لکم الویل مما تصفون۔"

یعنی بلکہ ہم تو حق کو باطل کے سر پر دے مارتے ہیں' اس کے دماغ کو کچل دیتے ہیں' وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور تمہارے لیے ویل ہے کہ تم ایسی بے ربط باتیں کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کی آیات تخلیق سے متعلق ہیں یعنی اس مادی نظریے کی تردید کرتی ہیں جو عالم کو فضول قرار دیتا ہے۔ انسانی زندگی اور انسانی معاشرہ اصول تخلیق کے تابع ہے۔ اگر تخلیق کی بنیاد لہو و لعب پر ہوتی تو انسان جو کہ تخلیق عالم کا مظہر ہے' اس کا وجود اور انسانی معاشرہ ہیچ و باطل قرار پاتا۔ مگر قرآن کریم فرماتا ہے:

"وما خلقنا السماء و الارض وما بینهما لاعبین (انبیاء / ۱۶)

یعنی اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کو کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنایا۔

ہم نے اس عظیم کائنات کو خلق کیا۔ ہم کھیل کھیلنے والے نہیں ہیں یعنی ہم نے بچوں کی طرح کوئی کھیل نہیں کھیلا جو بناتے اور بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم نے

کائنات کو بے مقصد خلق نہیں فرمایا۔ اس کے بعد فرماتا ہے "**بل نقذف بالحق.....**"

یہ آیت گویا ایک فرضی سوال کا جواب دے رہی ہے۔ سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کائنات کی بنیاد لہو و لعب پر نہیں ہے تو پھر دنیا میں پایا جانے والا باطل کیا ہے؟ کیا دنیا میں جھوٹ و خیانت کا وجود نہیں ہے؟ کیا ظلم و ستم' خونریزی اور فساد موجود نہیں ہے؟ پس یہ سب باطل عقائد اور بے معنی مسلک جو معاشرہ میں موجود ہیں' کیا ہیں؟

قرآن کریم اس سوال کے جواب میں فرماتا ہے کہ یہ سب طفیلی وجود ہیں۔ جب حق ظاہر ہوتا ہے تو وجود حق کے طفیل لازمی طور پر یہ سب چیزیں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں لیکن ان کو دوام نہیں ہوتا اور جلد ہی ناپید ہو جاتی ہیں۔

قذف کسی چیز کو زور سے پھینکنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً کسی پتھر کو اٹھائیں اور زور سے کسی انسان یا شیشے پر دے ماریں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ "**بل نقذف بالحق علی الباطل**" گویا فرماتا ہے کہ ہم حق کا غلہ بناتے ہیں اور زور سے باطل پر مار کر اسے ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ جب تم لوگ اسے قریب سے دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ باطل کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اور اسے تو ختم ہونا ہی تھا۔

"**فاذا هو زاهق**"

ایسا نہیں کہ وہ پہلے سے ہی زاھق (فنا ہونے والا) نہ تھا بلکہ اب اس طرح کا ہوا ہے بلکہ یہ ایک ایسی شے تھا کہ جب تک حق اس کے مقابلہ پر نہیں آیا تھا یہ بہت اہم دکھائی دیتا تھا۔ جونہی حق اس کے مقابلہ پر آیا تو پتہ چل گیا کہ یہ اندر سے کھوکھلا تھا۔ بلکہ اس کی مثال اس غبارے کی سی تھی جس میں ہوا بھر دی گئی ہو اور پھر وہ خالی ہو گیا ہو۔

۴۔ سورۂ اسراء آیت ۸۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

"**و قل جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل کان زهوقا۔**"

یعنی کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل فنا ہو گیا باطل تو بہرحال فنا ہونے ہی والا ہے۔

کہہ دیجئے کہ حق آگیا باطل تباہ ہو گیا لیکن یہ خیال نہ کریں کہ باطل کی پہلے سے کوئی حقیقت تھی اور اب حق نے آ کر اس کی جگہ لے لی ہے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ "ان الباطل کان زھوقا" یعنی باطل نیست و نابود تھا' اس کا محض ایک تصور و شکل ہی تھی۔ یہ فقط نمود ہی تھی اس کی کوئی ہستی و حقیقت نہ تھی۔

قرآن کریم کی نظر میں حق و باطل کی جنگ ایک ہستی کی دوسری ہستی کے ساتھ جنگ نہیں ہے۔ بلکہ یہ در حقیقت ہستی کی جنگ نیستی کے ساتھ ہے' کمال کی جنگ نقص کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ہر باطل کی بازگشت نقص کی جانب ہوتی ہے۔ ظالم اگر ظالم ہے تو اپنے نقص کی وجہ سے کسی کمال کی وجہ سے نہیں۔ یعنی یہ اس کی جہالت یا احساس کمتری کا نتیجہ ہے جس کے ذریعے وہ تلافی کرنا چاہتا ہے۔

الغرض قرآن کریم ہر چند کہ حق و باطل کی جنگ کا قائل ہے مگر باطل کی اصالت کا قائل نہیں۔ قرآن کریم کا نظریہ مادہ پرستوں کے نظریہ کے خلاف ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ شر انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت ہے ہی نہیں بلکہ وہ تغیرات اور پیداواری آلات کے تابع ہے۔ لہٰذا ایسے مادہ پرستوں کے سامنے کوئی مقام فضیلت نہیں نہ ہی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس کا دعویٰ کریں بھی تو یہ ان کے اپنے مکتب فکر کے خلاف ہو گا کیونکہ مقام فضیلت کی تجویز جو بذات خود ایک اسلامی تجویز ہے' وہی پیش کر سکتا ہے جو انسان کو اصلاح کے قابل سمجھتا ہو۔

قرآن کریم اقوام کے انجام اور تمدنوں کی تاریخ کا ذکر کرتا ہے۔ قرآن کیفیت کو نقل کر کے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ جس معاشرہ میں شر کا غلبہ ہو جائے' باطل کی حکمرانی قائم ہو جائے وہ معاشرہ فنا اور نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس معاشرہ وہ باقی رہتا ہے جہاں حق کی حکمرانی ہو۔ اس بات کے کئی شواہد ہیں جن کی جانب قرآن کریم میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بے شمار ایسے معاشرے گزرے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اس وجہ سے نازل ہوا کہ وہ حق کے راستہ سے بھٹک گئے تھے اور باطل کا رخ کر چکے تھے۔

ممکن ہے کہ انسان تاریخ پر نظر ڈالے تو اسے ظالم افراد نمایاں طور پر نظر

آئیں اور وہ کہہ اٹھے کہ تاریخ ظلمت محض کے بغیر کچھ نہیں۔ لیکن یہ فیصلہ صحیح نہیں۔ یہ فیصلہ اس وجہ سے ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تاریخ کو شخصیات وجود میں لاتی ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ ان کی مثال پانی کے اوپر آنے والے جھاگ کی سی ہے جو ختم ہو جاتا ہے۔

جب ہم تاریخ اسلام پر نظر ڈالتے ہیں اور ہارون الرشید کو دیکھتے ہیں' الف لیلہ کے اس ہیرو کے قید خانوں اس کی بادہ نوشی اور اس کے ظلم و ستم کا مشاہدہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ کا نمونہ ہارون ہی ہے۔ لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہارون فانی ہے۔ اسے بقا و دوام حاصل نہیں ہے۔ جو لوگ حقیقت میں زندگی جاری رکھتے ہیں۔ یعنی زراعت کرتے ہیں' پیداواری امور انجام دیتے اور لین دین کرتے ہیں' الغرض ایسے لوگ جو کام کرتے ہیں اور معاشرہ کے امور چلا رہے ہیں' آپ کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کی مثال جھاگ کے نیچے والے پانی کی سی ہے۔ ہارون جیسے افراد ان لوگوں کے وجود کے طفیل زندہ رہتے ہیں اور تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ ہارون جیسے افراد کا مقابلہ کرو' مایوس نہ ہو' یہ نہ کہو کہ ہارون جیسے افراد ہی معاشرہ کو چلاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ حضرت موسیٰؑ بن جعفرؑ ہی کو بقا حاصل ہوئی ہے جو ہارون الرشید کے محل کے پاس اس قید خانے میں بند ہوئے ہیں جہاں محل کے شور و غوغا اور مستی کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ ہرچند کسی کو آپؑ سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی مگر اس کے باوجود ہزاروں لوگوں کے دلوں پر آپؑ کی حکومت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ بن جعفرؑ کی فکر اور سوچ ابدی بن جاتی ہے جبکہ ہارون الرشید اپنی ساری شوکت' جاہ و جلال اور دبدبہ کے باوجود نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

ان مقدمات کو بیان کرنے کے بعد کہ جو قدرے طولانی ہو گئے ہیں' اب ہم زیر بحث دو مثالوں کی تفسیر کی جانب آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"مثلھم کمثل الذی استوقد نارا....."

ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے بیابان میں جن کے پاس روشنی کا کوئی وسیلہ نہ ہو۔ لہٰذا وہ آگ جلاتے ہیں تاکہ اسی کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں۔ اچانک

ہوا چلتی ہے جو اس آگ کو دفعتاً بجھا دیتی ہے اور دوبارہ ان کو اندھیرے میں چھوڑ دیتی ہے۔

یہاں آگ اور نور سے مراد باطل کے پیروکاروں کی مکارانہ چالیں ہیں نور حق مراد نہیں جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان کی ہدایت کے کچھ طریقے ہیں۔ ان میں ایک فطرتی ہدایت ہے جو انسان میں کمزور لیکن حیوان میں بہت قوی ہوتی ہے۔ دوسری حواس کے ذریعہ ہدایت ہے، مثلاً انسان آنکھ، کان وغیرہ کے ذریعے شناخت پیدا کرتا ہے۔ تیسری ہدایت عقل و فکر کے ذریعے ہوتی ہے۔ ہدایت کا یہ سلسلہ "وحی" تک جا پہنچتا ہے۔ یہ سلسلہ ہدایت انبیاؑ کے پیروکاروں کے شامل حال ہوتا ہے۔

پس انسان کی فکر جیسی بھی ہو اس کے لیے نور کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے روشنی عطا کرتی ہے۔ البتہ بعض لوگ اس نور کو نظام تخلیق سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اسی راستے میں استعمال کرتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "**والذین اهتدوا زادهم هدی و اتهم تقویهم (محمد/۱۷)**"

یعنی جن لوگوں نے ہدایت حاصل کر لی اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور ان کو مزید تقویٰ عنایت فرما دیا۔

لیکن بعض لوگ ہدایت کے راستہ کو چھوڑ کر اپنی فکر کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی عقل و فکر سے منصوبے بناتے ہیں جو سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ منصوبے ان کو صرف تھوڑا بہت آگے لے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن ان میں دوام نہیں ہوتا اور یہ افکار و منصوبہ جات جلد ہی خاک میں مل جاتے ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ ایسے لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک تاریک بیابان میں خود اپنے ہاتھ سے آگ روشن کرتا اور چاہتا ہے کہ اس تھوڑی سی آگ سے سارا بیابان روشن ہو جائے لیکن نہ صرف یہ کہ اس آگ کی روشنی بہت کم ہوتی ہے۔ یعنی صرف اس کے اردگرد ہی پہنچتی ہے بلکہ یہ آگ مستقل

نہیں ہوتی اور بہت جلد بجھ جاتی ہے۔ یعنی باطل چونکہ دھوکا' فریب اور غلامانہ منصوبوں کا سہارا لیتا ہے لہٰذا زوال و نابودی اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ توجہ فرمائیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ میں حق کی مثال اس بجلی کی مانند ہے جو ایک لمحہ کے لیے چمکتی اور پھر بجھ جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس کے برعکس فرماتا ہے کہ باطل وہ بجلی ہے جو ایک لمحہ کے لئے چمکتی اور اگلے ہی لمحے بجھ جاتی ہے۔ قرآن کے بقول یہ بجلی جونہی انسان کے ماحول کو روشن کرتی ہے وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ اسے نظر آنے لگا ہے۔ لیکن "**ذھب اللہ بنورھم**" اللہ تعالیٰ اپنی تبدیل نہ ہونے والی سنت کے بنیادی وسائل کے ذریعے انسان سے یہ نور لے لیتا ہے۔

"**و ترکھم فی ظلمات لا یبصرون**" اور اس کو ایسی تاریکیوں میں چھوڑ دیتا ہے جن سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

"**صم بکم عمی**....." صرف یہی نہیں کہ ان کی آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ ان کے کان بھی نہیں سنتے۔ اگر انسان کسی بیابان میں ہو' آنکھ سے نہ دیکھ سکتا ہو مگر کان سے سن سکتا ہو تو وہ کسی گاڑی کے ہارن یا اونٹ کے گلے میں بندھی گھنٹی کی آواز یا انسان کے قدموں کی چاپ کے ذریعے راستہ تلاش کر سکتا ہے' نیز اگر بولنے کی طاقت رکھتا ہو تو دوسروں کو آواز دے کر راستہ معلوم کر سکتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کی آنکھیں دیکھتی نہیں' ان کے کان بند کر دیئے گئے ہیں' یہ دوسروں کی آواز نہیں سن سکتے' ان کی زبان بھی گنگ ہے لہٰذا وہ پکار کر دوسروں سے مدد بھی طلب نہیں کر سکتے "**فھم لا یرجعون**" لہٰذا ان کی واپسی ممکن نہیں رہتی۔ پس ان کو وہیں دفن ہونا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن کریم اپنی تاریخ کو کس قدر سراہتا ہے اور ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اگر حق اٹھ کھڑا ہو تو غالب و فاتح ہو گا اور باطل شکست کھائے گا۔

یہ اس روشنی اور نور کی ایک مثال تھی جو لوگ خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتے ہیں۔ اس سے مراد وہ منصوبے ہیں جو یہ لوگ خود بناتے ہیں اور یہ صرف تھوڑے عرصے تک ہی ان کے کام آتے ہیں۔

بعض اوقات یہ لوگ اس نور سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو ان کا اپنا روشن کیا

ہوا نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے مقصد کے لیے بجلی چمکی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے جس سے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس تجربہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ سوچتے ہی کوشش شروع کر دیتے ہیں لیکن جونہی اس نور سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ نور بجھ جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اوکصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد و برق".....

یا ان کی مثال ایسی ہے کہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہو اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ ایسی صورت میں کئی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ موسلادھار بارش ایک تاریکی ہے' لازمی طور پر اس وقت بادل ہوتے ہیں' یہ دوسری تاریکی ہے' نیز رات کا وقت بھی ہے' یہ تیسری تاریکی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر صرف رات ہوتی اور بادل و بارش نہ ہوتے تو انسان ستاروں کے نور سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نیز اگر بادل ہوں لیکن بارش نہ ہو تب بھی کسی قدر روشنی ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ سب کچھ ہو مگر رات نہ ہو' دن ہو پھر بھی انسان بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے سورج کے نور سے فائدہ اٹھا کر راستہ دیکھ سکتا ہے۔ مگر قرآن کریم فرماتا ہے۔ **"فیہ ظلمات و رعد و برق"** (جس میں تاریکیاں' گرج اور چمک ہے) پھر ارشاد ہوتا ہے:

"یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت"

یعنی موت کے خوف سے کڑک سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں۔

آسمانی بجلی کی کڑک ان کو اس حد تک لرزہ براندام کر دیتی ہے کہ یہ لوگ موت کے خوف کے مارے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں تاکہ اس کی آوازیں نہ سن سکیں۔ اس کے بعد

"یکاد البرق یخطف ابصارھم" یعنی قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو چندھیا دے۔ گویا بجلی اپنی شدت سے ان کی آنکھوں کو چندھیایا چاہتی ہے۔

"کلما اضاء لھم مشوا فیہ" یعنی جب وہ چمک جائے تو چل پڑیں۔

طرح طرح کی تاریکیوں میں جونہی بجلی چمکتی ہے تو وہ اس کے نور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قدم اٹھاتے ہیں۔ لیکن یہ چمک ان کے لیے دیرپا نہیں رہتی بلکہ جلد ہی بجھ جاتی ہے لہٰذا یہ لوگ ایک قدم سے زیادہ آگے نہیں بڑھ

سکتے۔

"و اذا اظلم علیهم قاموا"

جب تاریکی چھا جاتی ہے تو اپنی جگہ پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

"ولو شاء الله لذهب بسمعهم و ابصارهم" اگر اللہ چاہے تو پہلے گروہ کی طرح ان کو نہ صرف تاریکی سے دوچار رکھے بلکہ ان سے سننے اور دیکھنے کی قوت بھی چھین لے۔

یہ ہے انجام تاریخ کے مکاروں اور چالبازوں کا۔ قرآن فرماتا ہے کہ آپ ان کی اصالت کے قائل نہ ہوں' ان سے خوف نہ کھائیں اور یہ مت سمجھیں کہ ان کو غلبہ حاصل ہوتا ہے بلکہ ان کا زوال یقینی ہے۔ جبکہ دوام و بقا حق کو حاصل ہے۔ یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ایک زمانہ آئے گا جب ملکیت ختم ہو جائے گی اور پیداواری آلات کا تکامل جبرا اشتراکیت کو وجود میں لے آئے گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں اشتراکی نظام قائم ہو وہاں تیرگی میں اضافہ ہوگا۔ پتہ چلا ہے کہ پیداواری آلات کے تکامل سے بھی کام نہیں چلتا' صرف انسان ہی ہے جو عدالت اور روشنی لا سکتا ہے اور اسکے سائے میں سعادت کی زندگی گزار سکتا ہے۔

"ان الله علیٰ کل شیء قدیر" بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

-----○☆○-----

یا ایها الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون ○ الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء و انزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم فلا تجعلوا لله اندادا و انتم تعلمون○

ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے والوں کو بھی خلق کیا ہے شاید تم اس طرح پرہیزگار بن جاؤ۔ اس پروردگار نے تمہارے لیے زمین کا فرش اور آسمان کا شامیانہ بنایا اور پھر آسمان سے

پانی برسا کر تمہاری روزی کے لیے زمین سے پھل نکالے لہٰذا جان بوجھ کر کسی کو اس کا شریک اور مثل نہ بناؤ۔

"یا ایھا الناس اعبدوا ربکم" یہ دونوں آیات آپس میں مربوط ہیں۔ دوسری آیت پہلی کی تکمیل کرتی ہے اور دعوت توحید دے رہی ہیں۔ توحید اسلام کا بنیادی اصول ہے اور تعلیمات انبیہ کی فکری و اعتقادی بنیاد اسی پر ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ پہلی آیت **"یا ایھا الناس"** کے خطاب سے شروع ہوتی ہے۔ "ناس" کا لفظ قرآن مجید میں بہت زیادہ آیا ہے' خطاب کی صورت میں بھی جیسے زیر بحث آیات میں ہے اور دوسری صورتوں میں بھی مثلاً **للّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع** (آل عمران / ۹۷)

لفظ "ناس" اور لفظ "انسان" کا ماخذ ایک ہی ہے۔ ان میں زیادہ فرق نہیں۔ صرف ادبی حوالے سے ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ "انسان" اسم جنس ہے جبکہ "ناس" اسم جمع ہے۔ یعنی جب ہم "انسان" کہتے ہیں تو ہماری مراد انسان کی نوع ہوتی ہے اور جب ہم "ناس" کہتے ہیں تو اس سے تمام انسان مراد ہوتے ہیں۔ یہ لفظ "قوم" کی مانند ہے جو تمام لوگوں کے معنی میں آتا ہے۔ پس **یا ایھا الناس** کے معنی اے انسانوں کے گروہ ہو گا یا اے انسانی معاشرہ' اے دنیا کے سب انسانو۔

اس کی وضاحت ضروری ہے جو اس طرح ہے کہ ہر مکتب میں چار چیزیں ہمیشہ آپس میں وابستہ اور مرتبط ہوتی ہیں۔

۱۔ اس مکتب کے مخاطبین کون لوگ ہیں یعنی یہ مکتب کن لوگوں کے لیے ہے' کیا سب لوگوں کے لیے ہے یا کسی خاص جماعت کے لیے اور اگر کسی خاص جماعت کے لیے ہے تو وہ جماعت کن افراد پر مشتمل ہے؟

۲۔ اس مکتب کے پیش نظر ہدف کیا ہے؟

۳۔ اس مکتب کا تصور کیا ہے؟

۴۔ اس مکتب کی تعلیمات کیا ہیں' یعنی کیا تعلیمات سے مراد اس مکتب کے تمام احکامات اور راہنما اصول ہیں؟

یہ چاروں چیزیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کا انحصار کہ تصور کیسا ہونا چاہیے اس بات پر ہے کہ اس مکتب کے مخاطبین کون لوگ ہیں' اس کے برعکس یہ کہ اس تصور کے لیے اس بات پر انحصار کرنا ہوگا کہ مخاطبین کون لوگ ہیں' ان کے تخیل و تصور کا انحصار کس چیز پر ہے' پھر ان سب کا انحصار اس پر ہو کہ اس مکتب کا ہدف کیا ہے' نیز ان سب چیزوں کا انحصار اس پر ہو کہ اس مکتب کی تعلیمات کیا ہیں یعنی اپنے مخاطبین کے لیے کس پیغام کا حامل ہے۔

زیر بحث آیت میں ان میں سے دو چیزیں بیان ہوئی ہیں یعنی مخاطبین اور پیغام۔ پیغام توحید کا ہے جو اسلام اور قرآن کا بنیادی پیغام ہے۔

قرآن کے مخاطبین

مکاتب و مسالک چاہے الٰہی ہوں یا انسان کے خود ساختہ ان میں سے ہر ایک کے مخاطبین ہوتے ہیں۔ مخاطبین کے اعتبار سے مکاتب مختلف طرح کے ہوتے ہیں۔ مثلاً ممکن ہے ایک مکتب قومیت کے رنگ میں ہو۔ جیسا کہ تشکیل پانے والی اکثر جماعتوں پر قومیت کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد (کم از کم ان کے اپنے بقول) اپنی قوم کی آزادی اور سعادت ہوتا ہے۔ بنابریں ان کے مخاطب ان کی اپنی ہی قوم کے افراد ہوتے ہیں دوسری قومیں ان کی مخاطب نہیں ہوتیں۔ مثلاً انگلستان میں لیبر یا قدامت پسند جماعت وجود میں آتی ہے تو ان کی مخاطب انگلستان کی قوم ہی ہوتی ہے۔

ممکن ہے کسی مکتب پر نسل و خون کا رنگ چڑھا ہوا ہو یعنی اس کا مقصد صرف ایک ہی معاشرہ اور نسل کی نجات ہو۔ لامحالہ اس کی مخاطب بھی وہی نسل ہوگی۔ مثلاً وہ تحریکیں جو سفید فاموں کے خلاف چلائی جاتی ہیں ان کے مخاطبین صرف سیاہ فام ہوتے ہیں۔

کبھی ایسا تخیل معرض وجود میں آتا ہے جس کے پیش نظر بھوکوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ اس تخیل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بھوکوں کو آپس میں متحد ہو کر طاقتور بننا چاہیے تاکہ ان لوگوں سے نجات پا سکیں جو ان کے حقوق کو غصب کیے ہوئے

ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تخیل کے مخاطبین صرف بھوکے لوگ ہی ہوں گے۔ مثلاً مارکسزم کا دعویٰ ہے کہ وہ مزدوروں کی سعادت و نجات کے لیے معرض وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا اس کے مخاطبین صرف مزدور ہی ہیں۔ اس تخیل میں سرمایہ دار کو اپنا رکن نہیں بنایا جاتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دعوت اسلام کا مخاطب کون ہے اور کون لوگ اس کے رکن بنتے ہیں؟ کیا ایسا ہے کہ چونکہ اسلام عربوں کے درمیان ظاہر ہوا تھا اس لیے اس کے مخاطبین صرف عرب ہیں یا چونکہ یہ مکہ میں ظہور پذیر ہوا تھا اس لیے اس نے صرف اپنی قوم یعنی اہل مکہ ہی کو اپنی طرف دعوت دی ہے؟

جب ہم قرآن مجید کے مخاطبین پر نظر ڈالتے ہیں تو اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ قرآن مجید کسی مقام پر بھی **"یاایھا العرب"** **"یاایھا القریش"** **"یاایھا المکیون"** **"یاایھا المدنیون"** یا **"یاایھا الشامیون"** کہہ کر خطاب نہیں کرتا۔ بلکہ قرآن مجید کے خطابات دو طرح کے ہیں: ایک وہ خطاب ہے جو دعوت کے وقت **"یاایھا الناس"** کے الفاظ میں کیا گیا ہے یعنی اے سب انسانو! دوسرا خطاب ان لوگوں سے ہے جنہوں نے دعوت قبول کر لی ہے۔ لہٰذا جب ان کو کوئی حکم دینا چاہتا ہے تو **"یاایھا الذین امنوا"** (اے وہ لوگو جو ایمان لے آئے ہو) کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ساری انسانیت کو مخاطب کرنا اصولاً صحیح ہے اور کیا اس پر عمل درآمد ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان چونکہ فلسفہ کی اصطلاح میں ایک انتزاعی مخلوق ہے لہٰذا وہ کسی مکتب کا مخاطب نہیں بن سکتا۔ نیز کہتے ہیں کہ انسان چونکہ انسان ہے اس لیے اس کا کوئی وجدان نہیں ہے۔ اگر کوئی مکتب فکر انسان کو اپنا مخاطب قرار دے تو وہ کوئی حرکت پیدا نہیں کر سکتا۔

ایرانیوں، عربوں، عجمیوں کو مخاطب کرنا ممکن ہے اور ان کا قومی وجدان ان میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اے ایرانیو، اے عربو، اے اہل مصر.... ، تمہیں ایسا ہونا چاہیے ان خطابات میں ایک خاص جذبہ

قومی کا سہارا لیا گیا ہے یا اس طرح نسلی غرور کو مشتعل کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے اے سیاہ فامو' اے سرخ فامو' نیز کسی خاص طبقہ کو مخاطب کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہر طبقہ ایک وجدان کا حامل ہوتا ہے یعنی کہا جا سکتا ہے اے ناداروں کے گروہ' اے مزدوروں کے گروہ' اے کسانوں کے گروہ۔ ان خطابات میں در حقیقت طبقاتی وجدان ہی کا سہارا لے کر حرکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ مزدوروں کو جو خطاب کیا جاتا اور کہا جاتا ہے کہ اے مزدورو! تمہارے پاس دولت کم کیوں ہے تو اس میں حرکت پیدا کرنے والا محرک اس کے اپنے مفادات ہی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ میرا حق کوئی دوسرا کیوں لے جائے؟ آپ نے اسی احساس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بنابریں اگر کوئی مکتب "اے انسان" کہے تو اس مکتب کے سامنے کیا چیز ہو سکتی ہے؟

اہم مسئلہ یہی ہے اس لیے ہم نے کہا ہے کہ تخیل مخصوص کسی بھی مکتب کے مخاطبین کی تعیین کرتا ہے اور یہ دونوں آپس میں مرتبط ہیں۔

اسلام انسان کے حوالے سے یہ نہیں کہتا کہ اس کا وجدان اس کی قوم یا اس کی نسل یا کسی خاص طبقہ میں وجود میں آتا ہے بلکہ اسلامی تخیل میں فطرت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ (**كل مولود يولد على الفطرة**) یعنی ہر نومولود ایک فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں کسی مناسب مقام پر مفصل بحث کر چکے ہیں۔

مذکورہ اصول کی بنا پر پروردگار عالم نے سلسلہ تخلیق میں انسان کو ایک شریف وجدان اور ملکوتی روح عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **ونفخت فيه من روحى**" (حجر/۲۹) (اور جب میں اس میں اپنی روح پھونک دوں) بنابریں جو کوئی بھی متولد ہوتا ہے وہ جن والدین کا بچہ بھی ہو اس میں ایک شریف وجدان پایا جاتا ہے' جبکہ قومی وجدان' نسلی وجدان' طبقاتی وجدان یہ سب کے سب اکتسابی وجدان ہیں اور دعوت اسلامی میں صرف شریف وجدان ہی کو مخاطب قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اسلام کہتا ہے کہ انسان چونکہ تو انسان ہے اس لیے میں تجھے ہی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ اے محروم چونکہ تو محروم و نادار ہے' یہ بھی نہیں کہتا کہ اے سیاہ فام چونکہ تو سیاہ فام ہے' وغیرہ وغیرہ ...... یعنی دعوت اسلامی کی بنیاد انسانی جذبہ

پر رکھی گئی ہے قومی و نسلی افتخار یا مادی مفادات پر نہیں۔ بالفاظ دیگر انسان جو عدل کا طلبگار ہے اس وجہ سے مخاطب نہیں ہوتا کہ اس کے مفادات عدل میں مضمر ہیں بلکہ اس وجہ سے مخاطب ہوتا ہے کہ عدل انسانی اقدار میں سے ایک ہے۔

قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ اسلام کا بنیادی مقصد عدالت کا قیام ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب عدالت قائم ہوتی ہے تو ظالموں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور مظلوموں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن بہت فرق ہے ان دو باتوں میں کہ ہم کہیں کہ اسلام کا مقصد ہی کمزوروں پر احسان کرنا اور انہیں نجات دلانا ہے یا یہ کہیں کہ قرآن کریم کے مخاطبین صرف کمزور لوگ ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کمزوروں کو نجات تو دلاتا ہے لیکن اس کے مخاطبین تمام انسان ہیں حتیٰ کہ فرعون جیسے افراد بھی قرآن کریم کی دعوت کے مخاطب ہیں۔ قرآن حکیم کے نزدیک ہر انسان وہ فرعون ہی کیوں نہ ہو باطن میں ایک حقیقی انسان ہی ہوتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ فرعون جو اس وقت تم پر حاکم ہے ظالم و جابر ہے اور انسانیت کے دائرہ سے باہر نکل چکا ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ انسان ہے اس لیے اس میں ایک فطرت خداداد پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے پیغمبرؑ جب فرعون کی ہدایت کے لیے جاتے ہیں تو ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے اندر کے انسان کو اس کے مقابلہ پر لائیں' چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اذھب الی فرعون انہ طغی فقل لہ ھل لک الی ان تزکی و اھدیک الی ربک فتخشی" (نازعات / ۱۷)

یعنی (اے موسیٰؑ) فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے کہو کیا یہ ممکن ہے کہ تو پاکیزہ کردار ہو جائے اور میں تجھے تیرے رب کی طرف ہدایت کروں تاکہ تیرے دل میں خوف پیدا ہو جائے۔

یعنی اے موسیٰ جاؤ اور دیکھو کہ شاید تم فرعون کے اندر کے انسان کو جو اسیر ہے' نجات دلا سکو! اسے خبردار کرو!..... اور اگر تم یہ کام انجام نہ دے سکو تو باہر سے اس پر حملہ کرو۔ یعنی پہلے اسے اندر سے بیدار کرو اور پھر باہر سے اس پر حملہ کرو۔

توحید کا پیغام

زیر بحث آیات کا دوسرا حصہ اس پیغام پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کا بنیادی پیغام اور دوسرے تمام پیغامات کی بنیاد ہے۔ توحید کا پیغام خاتم النبین ؐ کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ سب انبیاؑ کی رسالت میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کو حاصل ہے۔

قرآن کریم لوگوں سے ہرگز یہ نہیں فرماتا کہ تم کسی کی عبادت کرو اور جس کی تم عبادت کرتے ہو اسے خدا ہی ہونا چاہیے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان عبادت کے بغیر زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ سب لوگ کسی نہ کسی طرح عبادت و پرستش کرتے ہیں اور یہ عبادت انسان کے ذاتی اور فطری غرائز کا حصہ ہے۔ یعنی انسان کی فطرت میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ کسی چیز کی تقدیس و تنزیہہ کرے اور خود کو اس کا مقرب بنائے۔

یہ رجحان سب انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ سب مادہ پرست انسان بھی عبادت گذار ہوتے ہیں حتیٰ کہ کارل مارکس کہتا ہے: "میں چاہتا ہوں کہ انسان کو غیر انسان کی پرستش سے چھٹکارا دلاؤں تاکہ انسان خود اپنی پرستش کرے" وہ جانتا ہے کہ انسان کو کسی چیز کی پرستش کرنی چاہیے۔ لیکن وہ اپنے بقول انسان کو حقیقی معبود دکھانا چاہتا ہے۔

قرآن کا پیغام یہ ہے کہ اے انسان! اپنے پروردگار' اپنے رب' اپنے مالک کی عبادت و پرستش کر۔ وہ مالک عالم ہستی جس کے ارادہ سے وابستہ ہے۔ اگر وہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

"**الذی خلقکم والذین من قبلکم**" جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو خلق فرمایا ہے۔ ہم اس سے قبل سورۂ حمد میں عبادت کے بارے میں بحث کر چکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ قرآن کے نزدیک عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو سجدہ کرے۔ اس کے علاوہ قرآن ہر اطاعت کو عبادت شمار کرتا ہے۔ اس لیے فرماتا ہے کہ جو شخص اپنی خواہشات کی

اطاعت کرتا ہے وہ خود پرست ہے۔ **"افر ءیت من اتخذ الٰہہ ہواہ"** (جاثیہ / ۲۳) کیا تو نے اس انسان کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟ خود پرستی کی اصطلاح شاید قرآن کریم سے ہی فارسی زبان میں آئی ہے واضح سی بات ہے کہ خود پرستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان حسب دستور اپنی ذات کو سجدہ کرے بلکہ اس سے مراد (اپنی خواہشات کی) اطاعت اور پیروی ہے۔

شرک اور توحید

یہاں اس نکتہ کو واضح کرنا ضروری ہے کہ توحید شرک کی ضد ہے۔ شرک کا لفظ مشارکت سے ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جو دعائیں کی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ **"و اشرکہ فی امری"** (طہ / ۳۲) یعنی رسالت کی تبلیغ کے سلسلہ میں ہارون کو میرا شریک قرار دے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا شرک کے معنی یہ ہیں کہ انسان غیر خدا کو ضرور اللہ کا شریک قرار دے یعنی بیک وقت اس کے دو معبود ہوں؟ اس کے برعکس اگر انسان اللہ تعالیٰ کی پرستش نہ کرے صرف کسی غیر خدا کی ہی پرستش کرے تو کیا یہ شرک نہیں ہوگا؟

مثلاً قرآن مجید میں قوم سبا کے واقعہ میں آتا ہے کہ ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا:

"جئتک من سبا بنباء یقین" (نمل / ۲۲)

یعنی میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں۔

میں آپ کے لیے یقینی خبر لایا ہوں۔ **"انی وجدت امراۃ تملکھم و اوتیت من کل شی و لھا عرش عظیم وجدتھا و قومھا یسجدون للشمس"** (نمل / ۲۳-۲۴) یعنی میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا جن پر ایک عورت حکومت کرتی ہے جس کا تخت بہت عظیم ہے۔ اس عورت اور اس قوم کو میں نے سورج کی پرستش کرتے پایا۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ جو سورج کی پرستش کرتے اور سورج

کے علاوہ کسی چیز کی پرستش نہیں کرتے' چونکہ ان کا ایک ہی معبود ہے لہٰذا وہ مشرک نہیں ہیں؟

قرآن کی اصطلاح میں شرک کے معنی صرف ثنویت کا قائل ہونا نہیں بلکہ شرک کے معنی اللہ کی بجائے اس کے غیر کو خدا جاننا ہیں۔ کیونکہ قرآنی منطق کے مطابق ہر چیز اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر خدا کو خدا کی جگہ پر رکھے تو وہ معبودیت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے لیے شریک کا قائل ہو گیا ہر چند وہ خود باطل معبود کے علاوہ کسی اور کی پرستش نہ کرے۔ لہٰذا جو لوگ صرف سورج کی پرستش کرتے ہیں وہ بھی مشرک ہیں۔

"لعلکم تتقون" تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

تقویٰ کے متعلق ہم نے جو تقریریں کی ہیں اور وہ چھپ بھی چکی ہیں' ان میں تقویٰ کے بارے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ البتہ زیر بحث آیت سے جس چیز کا تعلق ہے اور جس کی یاد دہانی ضروری ہے یہ ہے کہ اس آیت میں تقویٰ کو توحید کا نتیجہ شمار کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسا کیونکر ہے؟

تقویٰ "وقی" سے مشتق ہے جو حفاظت کے معنی رکھتا ہے اور طہارت و پاکیزگی اس کا لازمہ ہے۔ البتہ قرآن اور اہل بیت طاہرینؑ کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان کی مانند تقویٰ کے بھی درجات و مراتب ہیں۔

ہر پاکیزہ عقیدہ کے لیے پاک ماحول درکار ہوتا ہے یعنی جس طرح زمین میں بوئے جانے والے گندم کے بیج کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ زمین جملہ آفات اور کثافتوں سے پاک ہو۔ صحیح افکار و نظریات کی نشوونما کے لیے پاک اور سالم روح درکار ہوتی ہے۔ اگر ناپاک روح کسی پاکیزہ فکر کی حامل ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے جس کے نتیجہ میں یا تو روح کو سر تسلیم خم کرنا اور پاک ہونا پڑتا ہے یا پھر روح غالب آتی ہے اور اس فکر کو اپنی بساط لپیٹنا پڑتی ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے جو اہل تقویٰ ہیں۔ اس تقویٰ سے مراد وہی اولین فطری تقویٰ ہے جس پر سب پیدا ہوتے ہیں اور جنہوں نے تقویٰ کے اس درجہ کو اختیار کیا ہو تو

قرآن کی ہدایت ان کے شامل حال ہوتی ہے لیکن جو لوگ دوسری باتوں میں ملوث ہو گئے ہوں وہ کلام حق کو قبول نہیں کریں گے۔

قرآن مجید زیر بحث آیت میں فرماتا ہے کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اس کی روح قوی ہو جاتی ہے' اس کی پاکیزگی میں اضافہ ہو جاتا ہے' وہ پاکیزہ عقائد کو بطریق احسن قبول کرتا ہے اور پاکیزہ اعمال اس سے سرزد ہوتے ہیں۔

"الذی جعل لکم الارض فراشا" (بقرہ / ۲۲) (اس پروردگار نے تمہارے لیے زمین کا فرش بنایا) انسان اس خدا کی عبادت کیونکر نہ کرے جبکہ وہ کائنات بھر میں اپنے پروردگار کی ربوبیت کے مظاہر دیکھ رہا ہے۔ یہ زمین جو آپ کے آرام کی خاطر بستر کی شکل رکھتی ہے کیا یہ اتفاقاً" وجود میں آگئی ہے یا ربوبیت کی معلول ہے؟ یہ آسمان کا نظام جو آپ کے سروں کے اوپر چھت کی شکل میں جلوہ گر ہے' قندیلیں جو اس کے ساتھ آویزاں ہیں اور ستاروں کی صورت میں چمکتی ہیں' کیونکر وجود میں آئے ہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ آسمان پر بادل چھایا ہوتا ہے' پھر بارش کی صورت میں زمین پر برستا ہے جس سے رنگ رنگ کے نباتات اگتے ہیں' طرح طرح کے پھلوں سے آپ کو نوازتا ہے' کیا یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آگیا ہے یا ان کا کوئی خالق اور پیدا کرنے والا ہے جو ایک منظم طریق کے تحت یہ سب کچھ انجام دیتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ایسے خالق کی' جس سے خیر' جود اور رحمت کے علاوہ کچھ صادر نہیں ہوتا' عبادت کرنی چاہیے اور اس پتھر کی نہیں جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ ضرر۔ نہ ہی اس انسان کی عبادت کرنا چاہیے کہ جس کی عبادت قید کے مترادف ہے۔ وہ ہستی جس کی عبادت بعینہ آزادی اور نجات ہے' "اللہ" ہے۔

غلاص حافظ از آن زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

-----○☆○-----

و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ و

ادعوا شهدائکم من دون اللّٰہ ان کنتم صادقین ○ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔ (بقرہ / ۲۳'۲۴)

ترجمہ: اگر تمھیں اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندہ پر نازل فرمایا ہے تو اس جیسا ایک سورہ ہی لے آؤ اور اللہ کے علاوہ اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو اور اگر تم ایسا نہ کر سکے بلکہ یقیناً نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافروں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

"وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا......

ان آیات میں قرآن کریم معجزہ کو زیر بحث لا رہا ہے یعنی قرآن کے معجزہ ہونے کو بیان فرماتے ہوئے لوگوں کو دعوت مبارزہ دے رہا ہے کہ اگر تم قرآن کریم کو صرف کتاب انسانی سمجھتے ہو تو اس کی مانند تم بھی کوئی کتاب لے آؤ۔

اس آیت میں قرآن کریم نے صرف اپنے مخاطبین کو دعوت مبارزہ دی ہے لیکن سورۂ اسراء میں پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ کے عربوں کو ہی نہیں بلکہ آپؐ کے عہد کے عرب و عجم تمام لوگوں یا روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو ہی نہیں بلکہ تمام ادوار کے سب لوگوں کو دعوت مقابلہ دی ہے حتیٰ کہ انسانوں کے علاوہ جنات کو بھی اس دعوت مقابلہ میں شامل کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا" (اسراء / ۸۸)

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اگر انسان و جنات سب متفق ہو کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار و پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

اس قسم کی آیات دو حقیقتوں کو واضح کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں معجزہ کا وجود ثابت ہے اور دوسری یہ کہ قرآن مجید بذات خود معجزہ ہے۔ قرآن کی رو سے ان دونوں میں سے کسی ایک کی تردید بھی نہیں کی جا سکتی۔

قرآن کے معجزہ ہونے سے انکار خود قرآن سے انکار ہے

ہمارے زمانہ میں کافی تعداد میں ایسے لوگ ملیں گے جو معجزہ کے رموز کا ادراک ہی نہیں رکھتے۔ ان کا دل تو چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی صورت میں قرآن کو تسلیم کرلیں مگر قرآن کے معجزہ ہونے کا انکار بھی کرتے ہیں یا دنیا میں وجود معجزہ ہی کے منکر ہیں۔ یہ لوگ قرآن میں بیان ہونے والے معجزات مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کے شگافتہ ہونے یا آپؑ کے عصا کا اژدھا بن جانے کی نامناسب تاویلات کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن سے انکار کے سوا کچھ نہیں۔

قرآن مجید متعدد آیات میں سابقہ انبیاؑ کے معجزات کو نقل کرتا ہے۔ زیر بحث آیت جیسی آیات میں قرآن کریم پہلے تو معجزہ کے وجود کو ثابت کرتا ہے اور پھر واضح فرماتا ہے کہ قرآن بھی اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ ہے۔ ہم ہی کو چاہئے کہ قرآن کریم جو ہمیشہ باضمیر لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے' کی دعوت پر لبیک کہیں اور غور وفکر کے قابل موضوعات جن میں سے ایک قرآن مجید کا بذات خود معجزہ ہونا ہے' پر انسانی ذہن کی حدود تک غور و فکر کریں' پھر اس راز سے جو اسلامی تعلیمات کے عظیم رازوں میں سے ایک ہے' پردہ اٹھائیں۔ چنانچہ اب ہم لفظ معجزہ کے لغوی معنی سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

لفظ معجزہ کے لغوی معنی

معجزہ کا لفظ "عجز" سے نکلا ہے۔ عجز کے معنی قدرت نہ ہونے کے ہیں۔ لہٰذا معجزہ سے مراد وہ عمل ہے جس کے انجام دینے پر دوسرے لوگ قادر نہ ہوں یعنی اسے انجام نہ دے سکتے ہوں۔

بعض اوقات معجزہ کی جگہ "خرق عادت" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اشاعرہ نے معجزہ کو ان معنی میں سمجھا ہے مگر یہ کوئی اچھے معنی نہیں ہیں۔

قرآن مجید میں نہ تو لفظ معجزہ استعمال ہوا ہے نہ ہی "خرق عادت" بلکہ یہ دونوں مسلمان علما کی وضع کردہ اصطلاحات ہیں۔ البتہ معجزہ کی اصطلاح عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے۔ یہ اصطلاح شاید آئمہ طاہرینؑ کے زمانہ میں بھی استعمال

ہوتی رہی ہے۔ جبکہ "خرق عادت" کی اصطلاح کو عام مسلمان استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ مسلمان متکلمین کی ایک خاص جماعت یعنی اشاعرہ' جن کے ذہن میں معجزہ کے یہی معنی آتے تھے' اس لفظ کو استعمال کرتے تھے۔

قرآن کریم نے اس مقصد کے لیے ایک اور لفظ استعمال کیا ہے اور وہ لفظ "آیت" ہے جو معجزہ اور خرق عادت دونوں کی نسبت وسیع تر معنی ادا کرتا ہے۔

قرآن مجید نے معجزہ کو آیت کیوں کہا ہے؟

"آیت" کے معنی نشانی یا پختہ دلیل کے ہیں۔ جس چیز کو ہم معجزہ کہتے ہیں قرآن نے اس کو آیت کیوں کہا ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ جب کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ پروردگار عالم کا فرستادہ ہے اسی نے اس کو بھیجا ہے اور اس پر وحی نازل فرماتی ہے۔ لہٰذا جو بھی وہ کہتا ہے اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا بلکہ یہ سب اللہ کا کلام ہے' تو کیا لوگوں کو بلا چوں وچرا اس شخص کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے یا نہیں؟ یہاں تین واضح احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک احتمال یہ ہے کہ داعی واقعی اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے' دوسرا یہ کہ یہ شخص جھوٹا اور دھوکا باز ہے اور اپنے جھوٹ سے باخبر بھی ہے۔ تیسرا یہ کہ شاید وہ غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہو' مثلاً اس کے باطن میں کوئی عمل یا تخیل پیدا ہوا ہو جس کو اس نے وحی سمجھ کر باور کر لیا ہو۔

تیسرے احتمال کا شکار بہت سے لوگ اتفاقیہ طور پر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی جھوٹ نہیں بولتے نہ ہی جھوٹ بولنا چاہتے ہیں مگر صداقت کے باوجود وہ توہمات کا شکار ہو کر غلط فہمی کی زد میں آجاتے ہیں۔ کفار جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نعوذ باللہ) مجنون کہتے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آپ چونکہ لوگوں کے سامنے اتنا اچھا کردار پیش کر چکے تھے کہ اگر وہ لوگ آپؐ کو جھوٹا کہتے تو کوئی بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ لہٰذا آپؐ کی دعوت کو ناکام بنانے کے لیے وہ آپؐ پر ایمان لانے والوں سے کہتے کہ یہ شخص نفسیاتی و روحانی توہمات کا شکار ہو گیا ہے۔ بنابریں نبوت کے مدعی کو اپنے دعویٰ کے

ثبوت کے لیے محکم دلیل لانا ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر لوگ اس بات کا مطالبہ کریں تو یہ ایک جائز مطالبہ ہوتا ہے کیونکہ اس مطالبہ یعنی دلیل کے بغیر دعوت قبول کر لینا احمقانہ عمل شمار ہوتا ہے۔

لہٰذا معجزہ اس محکم دلیل کو کہا جاتا ہے جو نبوت کے دعویٰ کو ثابت کرتی ہے اور اسی وجہ سے اس کو "آیت" کہا جاتا ہے۔

اس اصول کی بہتر وضاحت کی خاطر ہم درج ذیل مباحث کو بالترتیب بیان کرتے ہیں۔

۱۔ معجزہ کیا ہے؟

۲۔ کیا معجزہ ممکن ہے؟

۳۔ کیا معجزہ کبھی واقع ہوا ہے؟

۴۔ معجزہ کس طرح اس کے لانے والے کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے؟

۵۔ پیغمبر اسلامؐ اور معجزہ!

۶۔ قرآن کا اعجاز!

۱۔ معجزہ کیا ہے؟

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ معجزہ بذات خود کسی بڑی اہمیت کا حامل نہیں بلکہ اہم تر مسئلہ اللہ تعالیٰ کو ماننا یا نہ ماننا ہے یعنی اگر ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں تو پھر معجزہ کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یعنی جب ہم اللہ پر ایمان لے آئے ہوں کہ وہ قادر مطلق ہے تو یقیناً وہ **ان اللہ علی کل شئی قدیر** کی بنا پر قادر ہے کہ مردہ کو زندہ کر دے' عصا سے اژدھا بنا دے اور ایک لمحہ میں اپنے رسولؐ کو مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے جائے بلکہ تمام آسمانوں کی سیر کرائے۔

لیکن یہ تصور درست نہیں کہ اگر ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئیں تو باقی تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

وضاحت:

۱۔ ممکن ہے کوئی شخص معجزہ کی تشریح یہ کرے کہ معجزہ وہ ہے جو کسی سبب کے بغیر رونما ہو۔

معجزہ کی یہ تعریف بالکل غلط ہے۔ شاید مادہ پرستوں اور معجزہ کے منکرین نے یہ راگ الاپنا شروع کیا ہے جو زبان زد خاص و عام ہو گیا ہے۔ جو لوگ معجزہ کے معتقد ہیں وہ اس بات کو دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر معجزہ بلا سبب ہو تو یہ کسی بات کی دلیل نہیں بن سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بفرض محال اگر کوئی چیز بلا سبب پیدا ہو جائے تو پھر دنیا میں کسی بھی چیز کو ثابت نہیں کیا جا سکتا نہ علمی یا طبیعی اصول اپنی جگہ پر ٹھہر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی فلسفی و کلامی اصول حتیٰ کہ وجود باری تعالیٰ کا اثبات بھی متزلزل ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دنیا کے لیے ایک علت کے طور پر جانتے ہیں۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ دنیا میں کوئی نظام موجود ہی نہیں ہے بلکہ ہر شے علت کے بغیر بھی وجود میں آ سکتی ہے تو پھر ہم اس احتمال کو مسترد نہیں کر سکتے کہ ساری دنیا اتفاقاً" اور بغیر علت کے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ معجزہ کی یہ تعریف بالکل غلط ہے۔ ۱۵

۲۔ ممکن ہے کوئی اور جماعت یہ کہے کہ معجزہ یہ نہیں کہ کوئی چیز علت کے بغیر وجود میں آ جائے' یعنی قانون علیت میں استثنا نہیں ہے بلکہ معجزہ یہ ہے کہ کوئی دوسری چیز حقیقی علت کا قائم مقام ہو جائے۔ مختصر یہ کہ معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک علت دوسری علت کی قائم مقام بن جائے۔ مثلاً انسان کے پیدا ہونے کی حقیقی و واقعی علت دو انسانوں کا باہمی ملاپ ہے۔ اب اگر یہ علت واقعی موجود نہ رہے بلکہ کوئی اور علت اس کی جگہ لے لے یعنی کوئی انسان دو انسانوں کے باہمی ملاپ کے طریقہ سے ہٹ کر کسی طریقہ سے متولد ہو جائے تو یہ معجزہ ہو گا۔

یہ بات بھی علوم عقلیہ سے بے خبری کی بنا پر کہی گئی ہے کیونکہ ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ دنیا میں علت و معلول کا نظام حکم فرما ہے۔ یہ کوئی طے شدہ نظام نہیں

جس کو تبدیل کیا جا سکتا ہو بلکہ علت و معلول کے مابین ایک حقیقی رابطہ پایا جاتا ہے۔ یعنی فطرت میں ب کی علت اگر الف ہو تو الف اور ب کے درمیان ایک ایسا حقیقی رابطہ پایا جاتا ہے کہ نہ تو الف یہ رابطہ ب کے علاوہ کسی اور کے ساتھ رکھتا ہے اور نہ ہی ب کا یہ رابطہ الف کے علاوہ کسی اور کے ساتھ برقرار رہ سکتا ہے۔ ب ہرگز الف کے بغیر معرض وجود میں نہیں آ سکتی۔ الغرض ہر چیز کی علت حقیقی صرف ایک ہی ہے کوئی چیز بھی دو چیزوں کے ساتھ علت و معلول والا رابطہ نہیں رکھ سکتی پس مذکورہ مثال میں ج ہرگز الف کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ ہی "د" "ب" کی جگہ الف کا معلول بن سکتی ہے۔[۱۹]

۳۔ معجزہ کی ان دو تعریفوں کے مقابلہ میں ایک تیسری تعریف بھی ہے جس پر مذکورہ عقلی اعتراضات کسی صورت بھی وارد نہیں کئے جا سکتے وہ تعریف یہ ہے کہ معجزہ نہ تو قانون علیت کی نفی ہے اور نہ ہی اس کا نقض و استثنا ہے بلکہ یہ خرق ناموس فطرت ہے۔

خرق قانون علیت اور خرق ناموس فطرت میں فرق ہے۔ معجزہ یہ نہیں ہے کہ کوئی چیز حقیقی علت کے بغیر کسی اور ذریعہ سے وجود میں آ جائے بلکہ معمول اور طبیعی طریقہ سے ہٹ کر وجود میں آنے والی شے معجزہ کہلاتی ہے۔

بہتر تشریح

بالفاظ دیگر معجزہ یہ ہے کہ کوئی امر معمول سے اس طرح ہٹ جائے کہ اس میں مابعد الطبیعات کا اثر واضح دکھائی دے رہا ہو۔ بنا بریں معجزہ کے ظہور کے وقت کوئی علت کسی دوسری علت کی جگہ نہیں لیتی جبکہ علت و معلول کے درمیان پایا جانے والا حقیقی رابطہ تسلیم شدہ امر ہے۔ البتہ معجزہ کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ انسان جو اپنے علم و تجربہ کی بنا پر اشیا کی حقیقی علل تک دسترس حاصل کرنا چاہتا ہے' اشیا کی حقیقی علل کو نہیں جانتا' فقط اللہ تعالیٰ حقیقی علل کو جانتا ہے۔ انسان تجربات کے ذریعے صرف قربت و رابطہ اشیا تک رسائی حاصل کرتا ہے اور غلط طور پر ان کو علیت کا تعلق قرار دیتا ہے بنا بریں معجزہ وہ امر ہے جو معمول کے اس راستے سے

ہٹ کر وجود میں آیا ہو جس کو انسان اس کے وجود میں آنے کا واحد ذریعہ سمجھتا ہو۔ اس نکتہ کی وضاحت ایک مرتبہ پھر کریں گے۔

کیا معجزہ ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب کسی حد تک اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے یعنی اس بات کا انحصار کہ معجزہ ممکن ہے یا نہیں' معجزہ کی تعریف اور اس بات پر ہے کہ ہم اس کی توجیہ کس طرح کرتے ہیں! اگر ہم کہیں کہ معجزہ کسی چیز کے علت کے بغیر وجود میں آنے کو کہتے ہیں تو پھر معجزہ بظاہر ناممکن ہو گا۔ نیز اگر کہیں کہ معجزہ قانون علیت کے نقض کا نام ہے یعنی یہ کہ کوئی علت حقیقی علت کی جگہ لے لے تب بھی معجزہ ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم تیسرے معنی یعنی فطرت کے اپنے معمول سے ہٹ جانے کو تسلیم کر لیں' تو اس صورت میں معجزہ ممکن قرار پائے گا محال نہیں۔ یہاں ہم مزید وضاحت کرنے پر مجبور ہیں۔

یورپ کے مشہور فلسفی ہیگل کا بیان ہے جس کی بنیاد پر اس نے اپنے فلسفہ میں بہت سے مسائل کی طرح ڈالی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو عقل کے مسلمات میں شمار ہوتے ہیں عقل جن کی خلاف ورزی کی ہرگز اجازت نہیں دیتی' یعنی عملاً ان کی خلاف ورزی کی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ ریاضی کے مسائل کی مانند ہے جن کا نام اس نے "تعلیلی مسائل" رکھا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کہتے ہیں کہ ایک مثلث کے زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے یا دو قائموں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ عقل کے عین مطابق ہے۔ یعنی اگر عقل جان لے کہ مثلث کیا ہوتی ہے تو وہ فوراً فیصلہ دے دے گی کہ مثلث کے تمام زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے نہ ہونا ناممکن ہے حتیٰ کہ نصف درجہ بھی کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ فلسفہ و منطق میں جن اصولوں کو لازمی شمار کیا جاتا ہے وہ سب اسی طرح ہیں یعنی اجتماع نقیضین اور ارتفاع نقیضین۔

لیکن مسائل کی ایک قسم وہ ہے جو تجرباتی مسائل کہلاتے ہیں یعنی ہماری

عقل ان کے ادارک کو لازمی قرار نہیں دیتی بلکہ جیسا ہم ان کو پاتے ہیں ویسے ہی ان کو بیان کر دیتے ہیں۔

ہیگل ایسے مسائل کی مثال اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم نے دنیا میں اب تک جو تجربات کیے ہیں ان سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پانی سو درجہ حرارت پر بھاپ بن جاتا ہے ہم نے اس تجربہ کا نام علیت رکھا ہے۔ یعنی ہم کہتے ہیں کہ حرارت پانی کے بھاپ بننے کی علت ہے۔ اسی طرح جب ہم دیکھتے ہیں کہ سردی میں درجہ حرارت صفر سے نیچے گر جانے پر پانی منجمد ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ پانی کے انجماد کی علت سردی ہے۔

وہ کہتا ہے کہ انسانی عقل کے نزدیک ان باتوں میں سے کوئی ایک بھی ضروری امر نہیں ہے۔ ہم نے چونکہ ایسا ہی دیکھا ہے لہذا یہی نتیجہ نکالا ہے۔ اگر ہم نے ابتدائے آفرینش سے اس کے خلاف دیکھا ہوتا یعنی ہم حرارت کو انجماد کی علت اور سردی کو بھاپ بننے کی علت پاتے تو ہماری عقل کی رو سے اس میں کوئی فرق نہ پڑتا۔

معلوم ہوا کہ عقل ٹھنڈک کے نتیجے میں انجماد اور حرارت کے نتیجے میں بھاپ بننے کے لیے کوئی خصوصیت قرار نہیں دیتی بلکہ یہ صرف ایک اصول وجوبیت ہے۔ دنیا میں اب تک یہی ہوتا چلا آیا ہے' بغیر اس کے کہ اس کے برعکس کوئی صورت لازم و ضروری ہو۔

یہاں تک تو یہ بات بالکل صحیح ہے' حتی کہ بو علی سینا جیسے افراد بھی اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ ان کی تحریروں میں یہ بات زیر بحث آئی ہے کہ طبیعی علوم کے بارے میں جو ہمیشہ تجربہ کے مرہون ہوتے ہیں اور تجربہ ضرورت و لزوم کو ہمارے ہاتھ میں نہیں دیتا' کیا کیا جائے؟ اس نکتہ کو سامنے رکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ طبیعی علوم و قوانین کس طرح معتبر ہو سکتے ہیں اور کیا تجرباتی قوانین کو فلسفی علیت کے ضابطہ کے تحت لایا جا سکتا ہے؟

اس سلسلے میں ہم کہتے ہیں کہ جہاں تجربہ کسی تعلق کی نشاندہی کرتا ہے مثلاً حرارت بھاپ بننے کا اور سردی انجماد کا موجب بنتی ہے وہاں درحقیقت ایک علت

موجود ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ علت موجود نہ ہو اور محال ہے کہ اس علت کی جگہ کوئی دوسری علت لے لے۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ وہ علت یہی ہو جس کا انکشاف ہم نے تجربہ و آزمائش کے ذریعے اپنے حواس سے کیا ہے۔ لہٰذا تجربہ والے علوم میں ہر روز تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی ایک قانون منسوخ ہو جاتا ہے اور دوسرا قانون اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک زمانہ تھا جب لوگ دیکھتے تھے کہ پتھر کو جب اوپر سے چھوڑا جاتا اور وہ زمین پر گرتا تو وہ کہتے کہ پتھر میں ایک کشش پائی جاتی ہے جو اس کو زمین کے مرکز کی طرف لے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ یہ ایک اصول تھا جو بار بار کے تجربات کے نتیجے میں قائم ہوا تھا۔ اور سب اس پر متفق تھے۔ لیکن نیوٹن کے آنے کے بعد یہ نظریہ بدل گیا اور کہا جانے لگا کہ پتھر میں زمین تک پہنچنے کا میلان نہیں ہے بلکہ زمین کی کشش ہے جو پتھر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کے بعد نظریہ ارتباط سامنے آیا جس نے اصول ماقبل کی جگہ لے لی۔

بنا بریں یہ بات ثابت اور یقینی ہو گئی کہ واقعات علت کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتے لیکن کیا علم و سائنس ان علتوں تک رسائی حاصل کر سکیں گے یا نہیں۔ معلوم نہیں نہ ہی یہ صحیح ہے کہ ہم کس رابطے یا تعلق کا انکشاف ہوتے ہی اس کو علت قرار دینے لگیں۔ دراصل یہ علل حقیقی نہیں ہیں یعنی نہ تو حرارت تبخیر کا باعث ہے نہ برودت انجماد کا۔ نہ ہی کشش ثقل پتھر کے نیچے آنے کی وجہ ہے۔ اسی لیے اس قسم کے روابط ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اس سے ناموس طبیعت اور قانون علیت کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے مثلاً ناموس طبیعی کے مطابق اب تک یہی دیکھا گیا ہے کہ انسان کے پیدا ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے' وہ یہ کہ مرد و عورت کے نطفے آپس میں ترکیب پائیں تو اس سے انسان متولد ہوتا ہے۔

لیکن کیا یہاں قانون علیت حکم فرما ہے' یعنی کیا اس کے علاوہ ایسا ہونا محال ہے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت کے رحم میں وجود میں آنے والے خلیہ میں یہ استعداد پائی جائے کہ وہ عورت کے خلیہ کا کام بھی انجام دے اور مرد کے خلیے کا

بھی؟ عقل اس کا انکار نہیں کرتی لیکن ہم نے دراصل اب تک یہی دیکھا ہے اور ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ ایک اور طریقہ سے بھی یہ کام ہو سکتا ہو جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں مثلاً بیضہ تولید کے "پھوٹنے" سے عورت میں مرد کی فطرت تولید کی استعداد بھی پیدا ہو جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو اس سے علیت کا قانون نہیں ٹوٹتا بلکہ ناموس فطرت کا قانون ٹوٹتا ہے اور یہی معجزہ کا مفہوم ہے' یعنی معجزہ خرق نوامیس طبیعی ہے۔ اگر معجزہ کے یہ معنی لئے جائیں تو معجزہ ممکن ہو جائے گا۔

اب ہم ہیگل کے اصول کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگر دنیا میں کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور یہ کہے کہ میں ایسی مثلث بنا سکتا ہوں جس کے زاویوں کا مجموعہ ۱۹۰ درجے ہو گا تو اس کی فوراً تکذیب کر دی جائے گی کیونکہ یہ بات محال عقلی ہے جبکہ معجزہ سابقہ بیانات کے مطابق اس چیز کو ممکن نہیں بناتا جو عقلی طور پر محال ہو۔ لہٰذا یہ دعویٰ ہی بجائے خود مدعی کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی داعی نبوت یہ کہے کہ میں علت کے بغیر کوئی کام کر سکتا ہوں تب بھی اس کا دعویٰ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہو گا کیونکہ یہ دعویٰ عقل کے مسلمہ اصول کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

اگر کوئی دعویٰ کرے کہ وہ ناموس فطرت کے خلاف کوئی کام انجام دے سکتا ہے یعنی کوئی ایسا کام ہیگل کے بقول جس کے معتبر ہونے کی کوئی دلیل اس کے علاوہ ہمارے پاس نہیں کہ ہم نے اب تک اسی طرح ہی ہوتے دیکھا ہے' تو ہم اس دعوے کو تسلیم کر لیں گے۔

بالفاظ دیگر عقل کے قوانین مطلق ہیں مشروط نہیں' یعنی ان میں "اگر" کی شرط نہیں ہوتی جبکہ طبیعی قوانین مشروط ہوتے ہیں۔ یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ مثلث کے زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ کے مساوی ہے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس صورت میں ہو گا جب کوئی اس کے مانع نہ ہو جبکہ طبیعی قوانین میں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ قانون کشش اس بات کا متقاضی ہے کہ بڑا جسم چھوٹے جسم کو اپنی جانب جذب کرے بشرطیکہ کوئی مانع اس کی راہ میں حائل نہ ہو جائے' مثلاً اگر آپ اپنا

ہاتھ آگے بڑھا دیں اور پتھر کے زمین پر گرنے میں مانع ہو جائیں تو کشش کا قانون اپنا کام نہیں کرے گا۔

مختصر یہ کہ حقیقی علل و اسباب کو جان لینا انسان کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ علل انسان سے پوشیدہ ہیں۔ انسان صرف بعض رابطوں تک دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو تمام اسباب و علل سے آگاہ ہے۔

سورۂ طلاق آیت ۳ میں ارشاد ہوتا ہے: "**ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ**"

یعنی جو اللہ پر بھروسہ کرے گا اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

اس طرح ظاہری اسباب میں کسی سبب کی حاجت و ضرورت باقی نہیں رہتی پھر فرماتا ہے۔ "**ان اللہ بالغ امرہ**" (بے شک اللہ اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے) یعنی اللہ اپنے فرمان کو نتیجہ و حقیقت تک پہنچاتا ہے۔

لیکن اس لیے کہ کہیں لوگ یہ خیال نہ کرنے لگیں کہ دنیا میں علت و معلول اور حد بندی کا وجود ہی نہیں ہے فوراً فرمایا: "**قد جعل اللہ لکل شئی قدرا**" (اس نے ہر شے کے لیے ایک مقدار معین کر دی ہے۔) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک حد اور رابطہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس رابطہ کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔

یہ جو اللہ تعالیٰ جب بھی کسی کام کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے انجام دے دیتا ہے اور اس کے انجام پانے میں انسان کے جانے پہچانے اسباب میں سے کوئی سبب موجود نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسباب جو دکھائی دیتے ہیں وہ حقیقی اسباب نہیں ہوتے' فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ حقیقی سبب کونسا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب ارادہ کرتا ہے تو لوگوں کو علت و معلول کے رازوں سے آگاہ فرما دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان رازوں سے آگاہ ہو جائے تو وہ نظام علت و معلول کی خلاف ورزی کیے بغیر کائنات کے کاموں میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔

یہ معنی ہیں اس روایت کے کہ بندہ اپنے پروردگار کے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ اللہ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے' اس کا کان بن جاتا

ہے جس سے وہ سنتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ کام کرتا ہے۔

۳۔ کیا معجزہ واقع ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب بہت آسان اور سادہ ہے کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ معجزہ قانون علیت کے نقض کا نام نہیں کیونکہ دنیا میں بہت سے کام معمول سے ہٹ کر وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

بو علی سینا کا مقولہ بتایا جاتا ہے کہ اگر آپ یہ سنیں کہ کسی عارف نے ایک ماہ تک کوئی چیز نہ کھائی اور اس کے باوجود وہ مرا نہیں تو تعجب نہ کیجئے کیونکہ یہ کام قانون فطرت کے خلاف تو ہے لیکن کائنات کے مجموعی قانون کے خلاف ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ جو عام لوگ اگر مثلاً ۴۸ گھنٹے کچھ نہ کھائیں تو مر جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا بدن تحلیل غذا کے معمول کے مطابق اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس مدت کے دوران غذا اس کو ضرور ملے۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنی قوت ارادی کے ذریعے اپنے جسم کو اس حد تک مسخر کر لے کہ دل کی حرکت اس کے اختیار میں آجائے' نظام تنفس اس کے اپنے ارادہ سے انجام پائے' تحلیل غذا' معدہ اور نظام ہضم کی تمام فعالیتیں اس کی اپنی نگرانی میں انجام پائیں۔

ایسے افراد کی مثال ریاضت کشوں میں بہت زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ ایسے ایسے ریاضت کش بھی پائے گئے ہیں جو طویل مدت تک اپنی سانس روک سکتے اور سانس لئے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں جبکہ عام لوگ شاید ایک منٹ کے لیے بھی ایسا نہ کر سکیں۔

یہ قوت روح کی تقویت کا نتیجہ ہوتی ہے یعنی روح کو اس حد تک قوی کر لیا جاتا ہے کہ وہ جسم پر حکومت کرنے لگتی ہے۔

کہتے ہیں کہ روسی حکام بھارت میں اس قسم کی ریاضتوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ چیزیں ان کے لیے اس حد تک حیرت انگیز تھیں کہ جب واپس لوٹے تو کہنے لگے کہ یونیورسٹیوں میں ایسے کاموں پر تحقیق ہونی چاہیے' گویا یہ بھی ایک علم ہے۔

ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص کو بند تابوت میں لٹا کر قبر میں دفن کر دیا گیا جبکہ اس کے لیے سانس لینے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جب کچھ عرصے کے بعد اسے باہر نکالا گیا تو اس نے سانس لینا شروع کر دیا اور یہ صاف ظاہر تھا کہ مٹی کے نیچے جانے کے بعد اس نے اپنے اختیار کے ساتھ اپنی سانس کو روک لیا تھا جسے اب اس نے دوبارہ شروع کیا۔

بہر حال اس قسم کے اعمال کے وقوع پذیر ہونے کی بہت سی مثالیں ہیں اور ریاضت کے ذریعہ ہرچند کہ وہ غیر شرعی ہی ہو' قوت ارادی کی مدد سے مذکورہ تمام اعمال کو توجیہ کی جا سکتی ہے۔

بنا بریں جیسا کہ ہم نے کہا ہے معجزہ وہ کام ہے جو صرف نوامیس فطرت کے خلاف وقوع پذیر ہوتا ہے۔ چونکہ انبیا کرام اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے ساتھ کامل انسانوں کا نمونہ ہوتے ہیں' قوی ترین ارواح اور پختہ ترین ارادوں کے مالک ہوتے ہیں اس لیے ان کے ہاتھوں معجزہ کے رونما ہونے کی توجیہ بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔

۴۔ معجزہ کس طرح اپنے لانے والے کی صداقت کی دلیل بن سکتا ہے؟

علمائے منطق کہتے ہیں کہ دلالت تین طرح کی ہوتی ہے:

۱۔ دلالت قرار دادی۔

۲۔ دلالت طبیعی۔

۳۔ دلالت عقلی۔

۱۔ دلالت قرار دادی:

دلالت قرار دادی یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کی علامت قرار دیا جائے وہ اس طرح کہ اگر اس کے خلاف طے پایا گیا ہو تو خلاف پر دلالت کرے: مثلاً جس طرح الفاظ معانی کی دلیل بنتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھیں کہ ایک کھائی جانے والی چیز کو روٹی کا نام دیا گیا ہے اور "پانی" کو پی جانے والی چیز کا۔ اب

اگر اس کے برعکس ہوا ہوتا یعنی پانی کی جگہ روٹی اور روٹی کی جگہ پانی کا نام قرار دیا گیا ہوتا تو پھر یہی دلیل قرار پاتی اور اس میں کوئی قباحت نہ ہوتی۔ مطلب یہ کہ پانی کے لفظ اور مائع یا روٹی کے لفظ اور اس کے خوردنی مادہ کے درمیان کوئی ذاتی رابطہ موجود نہیں ہے۔

اسی طرح ٹریفک کے اشارے بھی اس کی مثال ہیں مثلاً سبز بتی کو اس بات کی علامت قرار دیا گیا ہے کہ گزرنے کی اجازت ہے۔ یہ ایک قرار دادی دلالت ہے۔ اگر اس کو ٹھہرنے کی علامت قرار دے دیا جاتا تو یہ اسی پر دلالت کرتی۔

سوال یہ ہے کہ کیا معجزہ بھی نبوت کے سچے ہونے پر اسی طرح دلالت کرتا ہے' یعنی کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ساتھ یہ طے کر لیا ہے کہ جب بھی وہ کسی سے ایک خاص قسم کے افعال سرزد ہوتے دیکھیں تو جان لیں کہ وہ اللہ ہی کی جانب سے آیا ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے وہ سب سچ ہے۔؟

یقیناً ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ لوگوں تک اپنا پیغام انبیاؑ کے ذریعے ہی پہنچاتا ہے اور ہم یہاں انبیاء ہی کے اثبات کا موضوع رکھتے ہیں۔

۲۔ دلالت طبعی:

دلالت طبعی سے دلالت تجربی مراد ہے مثلاً کھانسی سینے کے درد پر دلالت کرتی ہے یا نبض کی تیز حرکت بخار کی دلیل ہوتی ہے۔ یہ طبعی اور تجربی علامتیں ہیں یعنی یہ ایسی علامتیں ہیں جو تجربہ کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہیں۔

معجزہ کی دلالت یقیناً اس قسم کی بھی نہیں ہوتی کیونکہ معجزہ انسان کے تجرباتی مسائل میں سے نہیں۔

۳۔ دلالت عقلی:

اس سے استدلالی دلائل مراد ہیں مثلاً معلول کی دلالت علت کے لیے۔ جب عقل کسی وجود کو دیکھتی ہے تو چونکہ وہ اس بات کو محال سمجھتی ہے کہ کوئی چیز علت کے بغیر پیدا ہو سکے اس لیے فوراً وہ سمجھ جاتی ہے کہ اس کی علت بھی موجود ہے۔ اور اس کے لیے علت قرار دینے یا تجربہ کرنے کی مطلق ضرورت نہیں معجزہ

کی دلالت اس قسم کی دلالت ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے ہم کہتے ہیں کہ دلیل معجزہ کی نوعیت دو طرح سے بیان کی جا سکتی ہے۔ متکلمین نے عام طور پر کہا ہے کہ معجزہ ایک طرح کی دلالت عقلی پر مبنی ہے جو عملی نوعیت کی ہوتی ہے مثلاً انسان کی عقل کسی شخص کے عمل سے اس کی رضامندی سمجھتی ہے یا اس کی خاموشی سے اس کی رضا کا ادراک کرتی ہے۔ قول معصوم بھی جس کو فقہ میں شمار کیا جاتا ہے اسی قبیل سے ہے یعنی کہتے ہیں کہ اگر معصوم علیہ السلام صراحت کے ساتھ کسی کو وضو کرنے کا طریقہ بتائیں یا خود وضو کریں تو وہ ہمارے لیے حجت ہوگی اسی طرح اگر کوئی شخص معصومؑ کے سامنے وضو کرے اور معصوم اس کے عمل پر معترض نہ ہو تو دلالت عقلی کے ذریعہ معلوم ہو جائے گا کہ وضو کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کا وضو صحیح نہ ہوتا تو معصوم اسے ضرور ٹوکتے اور چونکہ معصوم نے اسے نہیں ٹوکا لہٰذا معصوم کی نظر میں یہ وضو صحیح تھا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ اگر صحیح نہ ہوتا تو امام اعتراض کیوں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل لوگوں کو جہالت میں رکھنے کے مترادف ہے۔ لوگوں کو جہالت میں رکھنا ایک برا اور ناپسندیدہ عمل ہے معصوم علیہ السلام ایسے عمل کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبوت کی حقانیت پر معجزہ کی دلیل بھی اسی قسم کی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب کوئی شخص لوگوں سے کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے آیا ہوں تو چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے تمام افعال سے آگاہ ہے لہٰذا اس شخص کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے حضور کیا گیا ہوتا ہے۔ پس جب وہ اپنے دعویٰ کے اثبات کے لیے کوئی غیر معمولی کام انجام دیتا ہے' اس کام کو اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے' یا اللہ تعالیٰ کی ذات سے تو یقیناً یہ اس کے سچا ہونے کی دلیل قرار پائے گا کیونکہ اگر وہ جھوٹا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو اسے یہ کام انجام نہیں کرنے دینا چاہیے تھا۔ کیونکہ اگر وہ شخص جھوٹا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر اس کی تائید فرمائی اور لوگوں کو جہالت کی طرف راغب کیا۔

یہ ہے وہ نظریہ جسے عام طور پر متکلمین معجزہ کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن دانشمندوں کا ایک گروہ معتقد ہے کہ متکلمین معجزہ کی حقیقت کو سمجھ ہی

نہیں سکے کیونکہ انہوں نے گمان کر لیا ہے کہ معجزہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلاواسطہ طور پر کوئی کام کسی پیغمبرؑ کے ہاتھوں انجام دلوائے بغیر اس کے کہ پیغمبرؑ کا اس کام کی انجام دہی میں کوئی ذاتی کردار ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبرؑ کے ہاتھ سے خود کام انجام دیتا ہے مثلاً حضرت عیسیٰؑ کسی مردہ کے سرہانے آکر فقط بیٹھتے تھے اور مردہ کو اللہ تعالیٰ زندہ کر دیتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کا اس کے زندہ ہونے میں کوئی کردار نہیں بلکہ ان کی حیثیت فقط ایک وسیلہ جیسی ہے۔ یعنی مردہ کو زندہ کرنا بلاواسطہ طور پر اللہ تعالیٰ کا اپنا فعل ہے۔ جس طرح ہمیں معجزہ کی انجام دہی میں کوئی دخل نہیں اسی طرح پیغمبروں کو بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر ہے۔ معجزہ اور معجزہ لانے والے شخص کے درمیان اس طرح کا حقیقی رابطہ برقرار رہتا ہے کہ اس عمل کا اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے صادر ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

معجزہ "ولی" کے روحانی اور معنوی کمال کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب اللہ کا ولی معجزہ دکھاتا ہے تو اس کی بشری قوت الٰہی قوت سے متصل ہو جاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے مافوق البشر ارادہ' قوت اور طاقت عطا فرماتا ہے۔

سابقہ بیانات سے واضح ہو گیا کہ ایک ولی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور عملی طور پر ریاضت کے نتیجہ میں اس مقام تک جا پہنچتا ہے کہ اس کا ارادہ اس حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ فطرت پر غلبہ پا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان عبادت و اطاعت پروردگار کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے اس حد تک قریب ہو سکتا ہے کہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا مکمل نمونہ بن جائے۔ بنا بریں جب اولیاء اللہ کوئی غیر معمولی کام انجام دیتے ہیں تو وہ کام خود کرتے ہیں لیکن ایک ایسی قوت کے ساتھ جو انسانی قوت سے بالاتر ہوتی ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے خیبر کا وہ دروازہ جس کو چالیس یا پچاس آدمی بمشکل ہلا سکتے تھے' ایک ہاتھ سے اکھاڑ پھینکا تو فرمایا:

"واللہ ماقلعت باب خیبر بقوۃ جسدانیۃ بل بقوۃ الھیۃ"

خدا کی قسم! میں نے خیبر کے دروازہ کو جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ قوت الٰہی نے میری نصرت فرمائی۔ یعنی حضرت علیؑ کے انسانی بازو میں اس کام کی قوت نہ تھی بلکہ ایک خدائی قوت نے ان کی اس حد تک نصرت کی کہ اگر اس جیسے دس دروازے بھی ہوتے تو انہیں بھی اکھاڑ پھینکنے پر قادر تھے۔

پس امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ میں نے دروازہ خیبر اکھاڑا۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے نہیں اکھاڑا' میں نے تو صرف اپنا ہاتھ دروازہ پر رکھا تھا لیکن دروازہ کو اکھاڑا اور پھینکا خدا نے تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ دروازہ کو میں نے اکھاڑا البتہ ایک خداداد قوت کے ساتھ۔ پس معجزہ کے معنی یہ ہوئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو بشر بشری قوت سے مردہ کو زندہ کرتا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے بشری قوت کے بغیر بلاواسطہ خود ایسا کیا تھا بلکہ بشر نے قوت الٰہیہ کے ساتھ مردہ کو زندہ کیا۔

لہٰذا واضح ہوا کہ نبوت کی حقانیت پر معجزہ کی دلیل دلالت عقلی ہے۔ البتہ اس طرح کی عقلی دلالت نہیں جو متکلمین نے بیان کی ہے بلکہ یہ ایک ایسی عقلی دلالت ہے جو سو فیصد منطقی ہے۔

پیغمبرؐ اسلام کے معجزات:

بعض مستشرقین اور عیسائی پادری قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر اعتراض کی شکل میں ایک مسئلہ زیر بحث لائے ہیں جس کو بعض مسلمان مصنفین نے بھی بیان کیا ہے البتہ انہوں نے اس مسئلہ کو ایک اور شکل میں بیان کیا ہے اور کسی حد تک اسے تسلیم بھی کیا ہے۔ وہ مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے معجزات سے متعلق ہے عیسائیوں نے یہ مسئلہ اس شکل میں پیش کیا ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آنحضرتؐ سے معجزہ طلب کیا جاتا تو آپؐ اس سے انکار فرماتے۔ قرآن اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے حتیٰ کہ معجزہ کے حوالہ سے آنحضرتؐ کی طرف سخت انکار کو منسوب کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے ثبوت میں کچھ آیات بھی پیش کی ہیں جن کی طرف ہم آئندہ اشارہ

کریں گے۔

عصر حاضر کے بعض مسلمان مصنفین نے اس مطلب کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ بنیادی طور پر معجزہ کا تعلق انسان کے آغاز حیات کے زمانہ یعنی ان ادوار سے ظاہر کیا ہے جب انسان وحشیانہ مراحل سے گزر رہا تھا اور ابھی وہ علم، عقل اور منطق کے مراحل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے چونکہ علمی و منطقی طریقوں سے انسان کے سامنے مسائل پیش نہیں کیے جا سکتے تھے لہٰذا سابقہ انبیا معجزہ لاتے تھے۔

بالفاظ دیگر انسان بچے کی مانند تھا جو منطقی و استدلالی باتیں نہیں سمجھتا بلکہ بقول شاعر۔

چونکہ با کودک سروکارت فتاد
پس زبان کودکی باید گشاد

(جب تیرا واسطہ کسی بچے سے ہو تو پھر اس سے بچوں کی زبان میں ہی بات کرنا چاہیے۔)

پس معلوم ہوا کہ معجزہ بچوں کی زبان ہے جو بچوں یعنی سابقہ ادوار کے انسانوں کے لیے ہے۔ لیکن جونہی انسان فکری بلوغ کے اس مرحلہ میں داخل ہوا جب اس کے ساتھ علم، منطق اور استدلال کی زبان میں بات کی جا سکتی ہو تو پھر معجزہ کی ضرورت نہیں رہی بلکہ جونہی کوئی پیغمبر مبعوث ہوا کہ کوئی اصلاحی پروگرام انسان کے سامنے پیش کرے یا انسان کے تکامل کے لیے قوانین مہیا کرے تو ادراک، عقل اور منطق بداماں انسان فوراً اسے قبول کر لیتا ہے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام اور سابقہ تمام انبیا میں یہی فرق پایا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اس وقت ظہور فرمایا جب تاریخ عالم کے اعتبار سے انسان توحش کے مرحلہ سے تفکر کے مرحلہ میں داخل ہو رہا تھا۔

علامہ اقبال اسی سلسلہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام ایسے تاریخی دور میں مبعوث ہوئے جس کا ماضی انسان کے بچپن اور وحشی پن کا مظہر تھا

جبکہ اس کا مستقبل علم و منطق کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم النبیین ؐ کی وحی دوسرے پیغمبروں پر ہونے والی وحی سے مختلف تھی۔ پیغمبر اسلام ؐ آئے ہی اس لیے تھے کہ لوگوں کو عقل و منطق کے مراحل میں داخل فرمائیں۔

علامہ اقبال اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے جو کچھ کہتے ہیں اس سے تقریباً یہی مفہوم نکلتا ہے کہ پیغمبر اسلام ؐ کا تعلق آپ ؐ کے سرچشمہ عمل یعنی وحی کے اعتبار سے ماضی سے اور روح رسالت کے لحاظ سے جو عقل' منطق' علم' تجربہ' آزمائش کی دعوت اور تاریخ سے عبرت پکڑنے سے عبارت ہے' مستقبل سے متعلق ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک ختم نبوت کا فلسفہ بھی یہی ہے مطلب یہ ہے کہ سابقہ بیان سے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک ختم نبوت اور دوسرا معجزہ کی عدم ضرورت۔ یعنی اس قسم کی نبوت و رسالت جو نبوت و رسالت آخر ہے۔ یعنی اس کے بعد نہ تو کسی دوسری نبوت اور رسالت کی گنجائش رہتی ہے اور نہ ہی معجزہ کی ضرورت کیونکہ معجزہ کا تعلق صرف ماضی ہی سے ہے۔

اقبال نے یہی انداز بیان اختیار کیا ہے اور بعض مسلمان مصنفین نے بھی اس کی پیروی کی ہے۔

ہم اس سلسلہ میں یہاں تفصیل کے ساتھ بحث کرنا نہیں چاہتے لیکن اجمالی طور پر عرض کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے ختم نبوت کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اس میں بہت بڑی غلط فہمی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ اقبال نے ختم نبوت کا انکار کیا ہے (جیسا کہ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں)۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس اقبال ختم نبوت کے قائل ہیں اگرچہ انہوں نے ختم نبوت کی جو توجیہہ پیش کی ہے وہ درست نہیں۔ انہوں نے جو فلسفہ بیان کیا ہے اس کا نتیجہ ان کے اپنے تصور ہی کے خلاف جاتا ہے۔ وہ جس توجیہہ کے ذریعے ختم نبوت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں' اگر ان کے کلام کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے ختم نبوت کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب دین ہی کی ضرورت نہیں رہی۔

فی الحال ہم اس موضوع پر بحث نہیں کریں گے بلکہ ہماری بحث معجزہ کے

بارے میں ہے۔ مذکورہ مصنفین کا کلام دو مطالب پر مشتمل ہے جن میں پہلا مطلب یہ ہے کہ انسان کے فکری بلوغ کے زمانہ میں بنیادی طور پر معجزہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دوسرے قرآن کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام اسی وجہ سے معجزہ لانے سے ہمیشہ انکار کرتا رہا ہے۔

ان دونوں مطالب پر بحث بہت ضروری ہے۔

مطلب اول ۔ یہ صحیح نہیں کہ انسان کے بلوغ فکری کے زمانہ میں معجزہ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، قرآن کریم نے معجزہ کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہمیشہ "آیت" کہا ہے۔ آیت یعنی علامت! کس چیز کی علامت؟ اس بات کی علامت کہ اس شخص کا کلام اس کا اپنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

ایک وقت ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی پیغمبر لوگوں سے صرف عقلی باتیں کرتا ہے یعنی ایسی باتیں جن کو ان دلائل کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہو جن سے علمی مسائل کو ثابت کیا جاتا ہے یعنی جن کو برہان یا تجربہ و آزمائش کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہو۔

اس صورت میں اسے کیا کہیں گے؟ اسے حکیم یا ایک بہت بڑا دانشمند کہیں گے لیکن حکیم و دانشمند و فلسفی اور پیغمبر کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے۔ دانشمند اور فلسفی کی باتیں عقول بشری کی سطح تک کی ہوتی ہیں جبکہ انبیا اس سے آگے کی باتیں کرتے ہیں۔ انبیا کی باتیں منطقی و عقلی ہونے ساتھ ساتھ اس پہلو کی حامل بھی ہوتی ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں ہماری نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں ہمیں بتائی گئی ہیں اور ہم آگے بتا رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی" (کہف / ۱۱۰)

(آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں سوائے اس کے کہ مجھ پر وحی آتی ہے)

یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں میں نے رات کو بیٹھ کر سوچا، میرا ذہن دوسروں کے اذہان سے بلند تر ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"نزل بہ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین"

(شعراء / ۱۹۳۔۱۹۴)

(اسے جبرئیل امین لے کر نازل ہوئے ہیں۔ یہ آپ کے قلب پر نازل ہوا ہے تاکہ آپ لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں)

میرا روئے سخن تمہاری جانب ہے۔ میری روح باطنی طور پر ایک اور مقام سے تعلق رکھتی ہے۔ وہاں سے مجھے پیغام ملتا ہے جسے میں تم تک پہنچاتا ہوں۔ میں پیغام لانے والا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام تم لوگوں تک پہنچاتا ہوں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ میں رسول و نبی ہوں یعنی میں بھیجا گیا ہوں اور دوسرے کا پیغام پہنچاتا ہوں۔

فرض کریں کہ کسی موقع پر سقراط کہتا ہے کہ اخلاق کے حوالہ سے میرا فلسفہ یہ ہے۔ اگر سقراط کی باتیں ہمیں عقل کے مطابق نظر آئیں تو ہم فوراً تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اگر سقراط کہے کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں یہ میری اپنی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور میں اللہ کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں تو اس وقت ہم کہیں گے کہ اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرو۔ تمہاری باتوں کا عقلی ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں۔ باتوں کا مطابق عقل ہونا اور چیز ہے لیکن خود اس شخص کی باتیں نہ ہونا اور اللہ کا کلام ہونا یا کلام کا اللہ کی طرف سے ہونے کی ضمانت ہونا، جس کے نتیجہ میں اس کی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے جزا یا مخالفت پر اس کی جانب سے سزا کا ملنا بالکل دوسری چیز ہے۔

بہت سے لوگ عقلی باتیں کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان کی اطاعت نہ کریں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ جو شخص کہہ رہا ہے کہ یہ میرا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو اگر اس کی اطاعت نہ کریں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوگی جبکہ اطاعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوگی۔

بنا بریں درست ہے کہ پیغمبر بلوغ فکری کے زمانہ میں دلیل و منطق کے ساتھ اپنی باتیں لوگوں کے سامنے ثابت کر سکتا ہے یعنی وہ کہہ سکتا ہے کہ غور و فکر

کرو اور میری باتوں کی حقانیت کو تسلیم کرو۔ لیکن اس کی باتوں کی حقانیت ایک چیز ہے اور ان کا اللہ تعالٰی کی جانب سے ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

فرض کریں ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؑ فرماتے ہیں کہ شراب نہ پیو یہ تمہارے لیے نقصان دہ ہے' یہ رجس ہے' نجس ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ تم اس کی دلیل چاہتے ہو تو ان شراب خواروں کو دیکھو جنہوں نے بہت عرصہ تک مے خواری کی اور دائم الخمر ہیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ ان کے اعصاب اور نظام ہضم کا کیا حال ہوتا ہے یعنی ان کے معدہ کا کیا حال ہوتا ہے؟ جاؤ اور تجربہ کر کے دیکھو کہ جو لوگ شراب پی کر مست ہو جاتے ہیں وہ معاشرہ کا کیا حال کرتے ہیں؟ تجربہ اس سے بڑھ کر تو نہیں ہوتا۔ مے خواری کی وجہ سے ہونے والی برائیاں اور مظالم کے اعداد و شمار اس کے قبیح ہونے کی دلیل ہیں۔ اب اگر لوگ عقل و منطق رکھتے ہوں تو سمجھ لیں گے کہ یہ حکم بالکل مطابق عقل ہے اور انہیں مے نوشی نہیں کرنی چاہیے۔

لیکن اس امر کا حکم پروردگار ہونا بالکل الگ مسئلہ ہے۔ پس بلوغ فکری کے تحت اگرچہ رسول اللہؐ کے تمام فرمودات کا ادراک ہم علمی و عقلی دلائل سے کریں اس لیے کہ اگر ہم آپؐ کی رسالت کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے معجزہ کی ضرورت ہوگی۔ یہاں تک مطلب اول کی بحث ہے۔

مطلب دوم ۔ جس طرح پہلے اشارہ کیا گیا ہے کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ معجزہ لانے سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی معجزہ تھا ہی نہیں۔

اس کے ثبوت میں انہوں نے چند آیات پیش کی ہیں جن میں واضح ترین سورۂ اسراء کی آیات ہیں جن میں ارشاد ہوتا ہے۔

"و قالوا لن نومن لک حتٰی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنۃ من نخیل و عنب فتفجر الانہار خلا لہا تفجیرا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ و الملائکۃ قبیلا او یکون لک بیت من زخرف او ترقی فی السماء و لن نومن لرقیک حتٰی تنزل

علینا کتابا نقرؤہ قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا" (اسراء / ۹۰ تا ۹۳)

(اور ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری نہ کر دو یا تمہارے پاس کھجور و انگور کے باغ ہوں جن کے درمیان تم نہریں جاری کر دو یا ہمارے اوپر اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو یا اللہ و ملائکہ کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کر دو یا تمہارے پاس سونے کا کوئی مکان ہو یا تم آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤ اور اس بلندی پر بھی ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب نازل نہ ہو جسے ہم پڑھ لیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار بڑا بے نیاز ہے اور میں صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے)

مکہ بے آب و گیاہ اور خشک سرزمین ہے۔ اس زمانہ میں مکہ میں کوئی جاری پانی نہیں تھا۔ اب بھی جو آب رواں ہے جس سے منیٰ و عرفات میں استفادہ کیا جاتا ہے' اس کی زیادہ مقدار طائف کی نہر سے آتی ہے۔ طائف مکہ کے جنوب میں بارہ فرسخ کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہارون الرشید جو مسلمانوں کے تمام بیت المال پر قابض تھا اس کی بیوی نے بہت زیادہ دولت خرچ کر کے پہاڑ کو کاٹ کر طائف سے مکہ تک نہر جاری کروائی۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ میں مکہ میں آب زمزم کے سوا کہیں پانی نہ تھا اور وہ بھی موجودہ مقدار میں نہ تھا۔ اس کو بعد میں کھود کر وسیع کیا گیا جس سے اس کا پانی زیادہ ہوا۔

پیغمبر اکرمؐ کے مخالفین یعنی کفار قریش نے آنحضرتؐ سے کہا کہ ہم ان شرائط پر آپ پر ایمان لاتے ہیں:

۱۔ زمین سے ہمارے لیے ایک چشمہ جاری کر دیں۔

۲۔ چونکہ مکہ میں کوئی باغ نہیں اس لیے آپ کا ایک باغ ہونا چاہیے جس میں انگور کے پودے زیادہ ہوں اور اس کے اندر نہریں بھی جاری ہوں۔

۳۔ یا جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں بلکہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قیامت کے دن دنیا الٹ پلٹ جائے گی' زمین و آسمان ایک دوسرے میں دھنس جائیں گے تو

اب آپ آسمان کے ٹکڑے ہم پر گرا کر دکھائیں۔

۴۔ یا آپ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو آسمان سے نیچے اتاریں اور وہ ہمارے سامنے آپ کی تائید کریں۔

۵۔ یا آپ دولت سے بھرے ہوئے ایک گھر کے مالک بن جائیں۔

۶۔ یا آپ آسمان کے اوپر جائیں اور وہاں سے ایک خط ہمارے لیے لائیں' ایک ایسا خط جس میں ہمیں مخاطب کیا گیا ہو اور آپ کی نبوت کی گواہی اس میں موجود ہو۔

یہ آپ پر ہمارے ایمان لانے کی شرائط ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

"قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا"

(آپ کہہ دیجئے کہ میرا پروردگار بڑا بے نیاز ہے اور میں صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔)

کہو سبحان اللہ! تم مجھ سے کس چیز کے طلبگار ہو۔ کیا میں ایک بشر اور رسول ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہوں؟

آخری جملہ سے استدلال کرتے ہوئے مفسرین کہتے ہیں کہ کفار نے پیغمبر اکرمؐ سے چھ طرح کے معجزات کا مطالبہ کیا اور آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و پاکیزہ ہے۔ یہ لوگ آخر کیا چاہتے ہیں؟ یہ مجھ سے کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ معجزہ کا تقاضا کیسا؟ میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

اس آیت سے عیسائیوں نے بھی استدلال کیا ہے اور روشن خیال مسلمانوں نے بھی۔ عیسائیوں نے اس کو اس بات کی دلیل بنایا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس کوئی معجزہ تھا ہی نہیں جبکہ روشن خیالوں نے اس کو اس مطلب کی دلیل بنایا ہے کہ معجزہ انسان کے اولین ناپختہ ذہن سے متعلق ہے اور چونکہ پیغمبر اسلامؐ کا تعلق بلوغ فکری کے زمانہ سے ہے اس لیے آپؐ نے معجزہ لانے سے انکار فرمایا۔

لیکن یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ یہاں ضروری ہے کہ ہم بنظر غائر ان مطالب کا جائزہ لیں۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ معجزہ کسی ناممکن کام کا نام نہیں ہے بلکہ محال ہے یعنی وہ چیزیں جو عقل کے نزدیک انہونی ہوں حتیٰ کہ اگر کسی کے پاس لامتناہی قدرت ہو تب بھی محال چیز انہونی ہی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ شخص اس چیز کو وجود دینے پر قادر نہیں بلکہ وہ چیز خود وجود میں آنے والی نہیں' یعنی بعینہ نیستی ہے' عدم ہے۔ پس جس چیز کی حقیقت ہی نیستی ہو وہ وجود میں نہیں آسکتی۔

پس معجزہ کا مطالبہ اور چیز ہے جبکہ کسی محال چیز کے وقوع میں لانے کا مطالبہ بالکل مختلف ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں معجزہ سے مراد وہ امر ہے جو فطرت کے معمول سے ہٹ کر رونما ہو۔ لیکن یہ فی نفسہ ممکن ہوتا ہے اور اس کے لیے مابعد الطبیعاتی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک ایک مطلب کی وضاحت ہوئی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمام انبیا کرامؑ کے پاس معجزہ ہونا ضروری ہے جو ان کے اس دعویٰ کی صحت کی دلیل بن سکے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئے ہیں اور صرف اس قدر کافی ہے۔ لیکن کیا جس چیز کا بھی لوگ مطالبہ کریں انبیاؑ اس کو پورا کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہو تو وہ نعوذ باللہ جادوگروں جیسے قرار پائیں گے۔

جب لوگ تماشہ دیکھنے کی کیفیت میں ہوں اور پیغمبرؑ کے پاس آکر کہیں کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو فلاں کام جو ہم کہتے ہیں' کر دیں' پھر دوسرا گروہ کوئی اور فرمائش کر دیتا ہے' اس کے بعد تیسرا گروہ اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے تو یہ تو مذاق ہوگا۔

پیغمبر صرف وہی معجزہ دکھاتا ہے جس سے ثابت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جب اتمام حجت ہو جائے تو پھر لوگ چاہے ہزاروں مرتبہ معجزہ کا مطالبہ کریں وہ کہتا ہے کہ حجت تمام ہو چکی اب معجزہ دکھانا مجھ پر لازم نہیں۔

دانشمندوں کے بقول انبیا کرامؑ لوگوں کی فرمائشوں کو پورا کرنے کے پابند نہیں ہوتے یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ اگر گھر میں کسی کا بچہ رو رہا ہو تو وہ اسے خاموش کرانے کے لیے گود میں اٹھائے' نبی کے پاس لے آئے اور کہے کہ آپ معجزہ دکھا سکتے ہیں' ذرا معجزہ دکھا کر اس بچے کا دل بہلا دیں۔

ایسا نہیں ہے بلکہ معجزہ اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جو شخص حقیقت کا خواہاں ہو وہ حقیقت کو سمجھ لے اور جان لے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے اور سچا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے فرامین کے مطابق عمل کرنے کا پابند ہے۔

دوسری بات جسے یہاں بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ سودے بازی نہیں کرتے یعنی ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ کسی نبیؑ کے پاس آکر کہیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو اس قدر دولت ہمیں دے دیں۔

انبیا کرامؑ تو اس لیے آتے ہیں کہ لوگ ایمان لائیں۔ ایمان سودے بازی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ پیغمبرؐ تو لوگوں کو انفاق کرنے کو کہتے رہے یعنی انہیں کہتے رہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ جب انبیائے کرامؑ لوگوں کو انفاق و جہاد کی دعوت دیتے تو اس دعوت کے قبول کیے جانے کے وقت کسی طرح کے انفاق کو بھی اپنی تحویل میں نہیں لیتے تھے بلکہ جب کوئی شخص ؟ کہتا کہ میں آپ کے بتائے ہوئے راستہ میں دولت خرچ کرنا چاہتا ہوں تو جونہی پیغمبر محسوس کرتا کہ وہ شخص دکھلاوے کے لیے دولت دینا چاہتا ہے تو اس کے مال کو قبول نہ کرتا یا جب کوئی شخص آکر کہتا کہ میں اسلام کا سپاہی بننا چاہتا ہوں تو آپؐ اس سے پوچھتے کہ تم کس لیے اسلام کا سپاہی بننا چاہتے ہو؟ وہ کہتا کہ چونکہ میں چاہتا ہوں کہ میرا نام تاریخ میں لکھا جائے۔ آپؐ فرماتے کہ جاؤ اپنا کام کرو۔ "**ماھجرت الی اللہ**" تم نے اللہ کی جانب ہجرت نہیں کی لہٰذا تم میں اخلاص و ایمان نہیں ہے۔

ان باتوں کو سامنے رکھنے سے مذکورہ آیات کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"لن نومن لک حتٰی تفجر لنا من الارض ینبوعا"

(ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری نہ کردو)

جاننا چاہئے کہ **نومن لک** اور **نومن بک** کہنے میں فرق ہے۔ اگر

یومن بہ کہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اگر **یومن لہ** کہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ اس کے فائدہ میں ایمان لاتا ہے۔

انہوں نے یہ نہیں کہا: **لن نومن بک** بلکہ کہا ہے **لن نومن لک** یعنی ہم آپ کے فائدہ کی خاطر ایمان نہیں لائیں گے۔ بالفاظ دیگر وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی جماعت میں شامل ہوں تو یہ آپ کے فائدہ میں جاتا ہے۔ آپ بھی ہمارے مفاد کا کوئی کام انجام دیجئے۔ اسی طرح **تفجر لنا** میں " ل " نفع کے معنی ادا کرتا ہے۔ اس میں صراحت ہو رہی ہے کہ وہ لوگ چشمہ اپنے فائدہ کے لیے طلب کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ معجزہ کا مطالبہ نہیں بلکہ خالصتاً" سودے بازی تھی۔

ارشاد ہوتا ہے:

"او یکون لک جنۃ من نخیل و اعناب فتفجر الانہار خلا لہا تفجیرا"

(یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں جن کے درمیان تم نہریں جاری کر دو۔)

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ آپ ایک ایسے باغ کے مالک ہوں جو کھجوروں اور انگوروں کے درختوں سے گنجان ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر رسول اکرمؐ کا مکہ میں ایک باغ ہو جس میں کھجور اور انگور کے بہت زیادہ درخت ہوں تو آپؐ یہ کھجوریں اور انگور فرشتوں کو تو نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس مطالبہ میں مکہ کے لوگوں ہی کا مفاد تھا۔ پس یہ بھی معجزہ کا مطالبہ نہ ہوا بلکہ ایک ایسے امر کا مطالبہ تھا جو ان کے اپنے مفاد میں تھا۔ بالفاظ دیگر وہ لوگ چاہتے تھے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم مکہ کو طائف میں بدل دیں جبکہ مکہ ایسی جگہ ہے جہاں نہ کوئی نہر ہے اور نہ ہی باغ۔ اسے طائف ایسے شہر میں بدل دیا جائے جو باغات اور درختوں سے پر ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا"

(یا ہمارے اوپر اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے گرا دو۔)

اگر کوئی شخص کسی پیغمبر کے پاس آکر معجزہ کا مطالبہ کرے اور کہے کہ اگر آپ معجزہ دکھا سکتے ہیں تو آپ کا معجزہ یہ ہونا چاہیے کہ مجھے مار ڈالیں تو کیا معجزہ کا تقاضا یہ ہونا چاہئے؟ ہرگز نہیں کیونکہ جب وہ مار ہی ڈالا جائے گا تو معجزہ کا کیا فائدہ ہوگا؟

کفار قریش کہتے ہیں کہ آپ کے کہنے کے مطابق قیامت کے دن آسمان نیچے آجائے گا۔ اگر آپ سچے ہیں تو ابھی اسے نیچے لے آئیں۔ اگر آنحضرتؐ یہ معجزہ دکھا دیتے اور وہ سب جل کر خاک ہو جاتے تو ان کے خاک ہو جانے کے بعد معجزہ سے کیا فائدہ ہوتا؟

ارشاد ہوتا ہے:

"او تاتی باللہ و الملئکۃ قبیلا"

یعنی اللہ اور اس کے ملائکہ کو ہمارے سامنے حاضر کیجئے کہ وہ خود ہم سے ہمکلام ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بھی ناممکن ہے کیونکہ ایسا ممکن نہیں کہ خدا بذات خود بندوں سے ہمکلام ہو۔

علاوہ ازیں اگر خدا انسانوں جیسا ہوتا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ سکتے اور اپنے کانوں سے اس کی آواز کو سن سکتے تو پھر پیغمبر کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

جس خدا کو پیغمبر اکرمؐ متعارف کروا رہے ہیں وہ ایسا ہے کہ:

"وللہ المشرق و المغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" (بقرہ / ۱۱۵)

(اور اللہ کے لیے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی۔ لہذا تم جس طرف بھی رخ کرلو اللہ موجود ہے)

نیز **"ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن"** (حدید / ۳)

(وہی اول ہے وہی آخر، وہی ظاہر ہے، وہی باطن۔)

پس وہ جسم نہیں ہے وہ آسمان کے اوپر نہیں ہے کہ اسے زمین پر منتقل کیا جائے۔ ان کے مطالبہ کے معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوق کی مانند ہو جائے جو واضح طور پر

محال ہے۔

اسی طرح فرشتے بھی ہیں کیونکہ وہ بھی مادی اجسام نہیں رکھتے کہ ہر انسان ان کو دیکھ سکے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ انسانی شکل میں بعض افراد کے سامنے نمودار ہوں۔ تاہم ہر حالت میں فرشتہ انسان کی جنس اور مادہ سے نہیں ہے کہ ہر انسان کے لیے اس کو دیکھنا ممکن ہو۔ لہٰذا یہ بھی ایک غیر معقول مطالبہ تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

"او یکون لک بیت من زخرف۔"

یہ بھی ایک مادی مطالبہ اور خالصتاً "سودے بازی" تھی۔ وہ لوگ اس قدر دولت پرست تھے کہ گویا دولت کے علاوہ کوئی چیز انہیں سوجھتی ہی نہ تھی۔

اسی طرح ان کا آخری مطالبہ یعنی ایک خط لانا' بھی ظاہر ہے کہ صرف بہانہ بازی تھی کیونکہ اگر فرض کریں کہ حضرت رسول اللہ' خط لے بھی آتے تو وہ کہتے کہ آپ خود سے یہ خط لکھ کر لائے ہیں۔

غرضیکہ ان مطالبات میں سے بعض تو صرف سودے بازی اور بعض حماقت پر مبنی تھے ان میں کوئی مطالبہ بھی حقیقت جوئی کے لیے نہیں تھا۔ لہٰذا پیغمبر اکرم' ان کے جواب میں فرماتے ہیں کہ میں بنی نوع انسان سے ہوں اور صرف پیغمبر ہوں اس کے علاوہ کچھ نہیں جس سے کیا جانے والا مطالبہ نہ تو سودے بازی ہونا چاہیے اور نہ ہی حماقت پر مبنی۔

پس مستفین کا یہ گمان درست نہیں ہے کہ ان کے مطالبات سابقہ امتوں کے ان مطالبات جیسے ہی تھے جو انہوں نے اپنے اپنے انبیا سے کئے تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم معجزہ دکھانے سے اجتناب کرتے رہے جبکہ دراصل ایسا نہیں ہے۔ اگر ان کے مطالبات معقول اور حقیقت جوئی کی خاطر ہوتے تو آنحضرت' ان کو ہرگز مسترد نہ فرماتے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں سابقہ انبیاؑ کے بہت زیادہ معجزات نقل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت نوحؑ" حضرت لوطؑ" حضرت ھودؑ" حضرت صالحؑ" حضرت موسیؑ" حضرت ابراہیمؑ" حضرت عیسیٰؑ اور دیگر بہت سے انبیائے اکرامؑ کے گوناگوں معجزات ذکر

ہوئے ہیں جو ناقابل تردید ہیں۔ تو کیا یہ بات قابل تسلیم ہو گی کہ رسول اللہ ؐ پر نازل ہونے والے قرآن میں انبیائے کرام ؑ کے تو اتنے زیادہ معجزات نقل ہوئے ہیں لیکن جب لوگ آپ ؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو آپ یہ کہہ دیتے ہیں کہ میں صرف ایک پیغمبری ہوں؟

اگر ایسا ہو تو پھر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم سے یہ سوال کیا جا سکتا تھا کہ جن انبیائے اکرام ؑ کے معجزات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں کیا وہ پیغمبر ؑ نہیں تھے یا یہ معجزات نہیں ہیں؟

لہذا ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو ان معجزات کی قسم سے نہیں ہیں۔ اگر یہ اس قسم کے ہوتے تو میں بھی دکھا دیتا۔

اس کے علاوہ قرآن کریم خود معجزہ ہے ہم عنقریب اس بارے میں بحث کریں گے کہ اس کے لیے نص قرآنی موجود ہے۔ اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا اس کے علاوہ کوئی اور معجزہ نہیں تھا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے بعض معجزات کو خود قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے ان میں سے ایک کے بارے میں فرماتا ہے:

"سبحان اللہ الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ التی بارکنا حولہ من آیاتنا انہ ہو السمیع البصیر"

(اسراء / ۱)

(پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہ پروردگار سب کی سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔)

قرآن کریم یہاں پوری صراحت کے ساتھ رسول اکرم ؐ کے ایک غیر معمولی سفر کو بیان فرماتا ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں؟

اس زمانے میں تیز ترین سواری اونٹ تھی، جیٹ اور جمبو جیٹ ایجاد

نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہؐ نے ایک ہی رات میں مسجد الحرام سے فلسطین تک سفر کیا۔ معجزہ کے علاوہ اس کی اور کیا توجیہہ ہو سکتی ہے؟

جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار قریش نے کہا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آپ نے اس رات ایسا سفر کیا؟ حضرت رسول اللہؐ نے ان کے جواب میں شام سے مکہ آنے والے قافلہ کی خصوصیات کو نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ قافلہ والے فلاں مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور آپس میں یہ گفتگو کر رہے تھے۔ لہٰذا کفار قریش کو معلوم ہو گیا کہ آپ اس قافلہ کے پاس سے گزرے تھے۔

اس کے علاوہ شق القمر کا واقعہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اقتربت الساعہ و انشق القمر وان یروا آیہ یعرضوا و یقولوا سحر مستمر" (قمر/۱'۲)

یعنی قیامت قریب آگئی' چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے' یہ لوگ جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک مسلسل جادو ہے۔

اس میں حضرت رسول اللہؐ کے ہاتھوں شق القمر کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ۱۷

اعجاز قرآن:

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے پیغمبرؐ خاتم النبیین ہیں' آپ کا دین آخری و ابدی دین ہے بلکہ سابقہ انبیاؑ سب کے سب اس دین کے مقدمہ تھے یعنی انہوں نے اس کے ابتدائی مراحل کو طے کیا تھا۔ اسی طرح انسان نے بھی ان کے مکتب میں ابتدائی مراحل ہی طے کئے ہیں تاکہ آخری مرحلہ کے لیے تیار ہو سکیں۔ نیز دین خاتم کے بعد کوئی نیا پیغمبر دنیا میں نہیں آئے گا اور یہ دین دنیا میں ہمیشہ باقی رہے گا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خاتمیت کا فلسفہ کیا ہے؟

ہم یہاں اس فلسفہ کو تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے "ختم نبوت" نامی ایک کتابچہ میں خاتمیت کے فلسفہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک نکتہ کا ذکر کرتے ہیں جو یہ ہے کہ دین خاتم بہت سی خصوصیات میں دیگر

ادیان سے مختلف ہے۔ ان خصوصیات میں سے ایک دین خاتم کا معجزہ ہے اور یہی اس کا اصلی معجزہ ہے۔ دیگر انبیائے کرام کے معجزات طبیعی حادثہ کی قسم سے تھے' مثلاً مردوں کو زندہ کرنا' یا عصا کا اژدھا بن جانا یا دریا کا شگافتہ ہو جانا وغیرہ۔ یہ سب کے سب وقتی اور عارضی حادثات ہیں یعنی ایسے واقعات ہیں جو کسی خاص لمحہ اور معین وقت میں رونما ہوئے اور ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔ اگر کوئی مردہ زندہ ہو جائے تو اس کا زندہ ہونا ایک لمحہ میں رونما ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ کچھ عرصے تک زندہ رہے لیکن آخر کار مر کر ختم ہو جائے گا۔

اگر کوئی عصا اژدھا بن جائے تو یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ایک معین وقت میں رونما ہوتا ہے اور پھر اپنی پہلی حالت پر لوٹ جاتا ہے سابقہ انبیائے کرامؑ کے تمام معجزات اسی قسم کے تھے۔ اسی طرح خود رسول اللہؐ کے بعض معجزات جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں' بھی اسی طرح کے ہیں۔ پیغمبر کرامؐ کا مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک جانا یا شق القمر کا واقعہ ایک رات یا ایک دن میں رونما ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن ایسے ابدی دین کے لیے جس کو صدیوں تک لوگوں میں باقی رہنا ہے اس قسم کا قلیل المیعاد معجزہ کافی نہیں۔ ایسے دین کے لیے ایک ابدی معجزہ لازم ہے۔ اسی لیے خاتم الانبیاؐ کا اصلی معجزہ کتاب کی قسم سے ہے۔ دیگر انبیا کرامؑ پر کتابیں بھی نازل ہوئی تھیں اور ان کے معجزات بھی تھے لیکن ان کی کتابیں ان کا معجزہ نہیں تھیں نہ ہی ان کا معجزہ کتاب کی صورت میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی۔ وہ خود بھی کہا کرتے تھے کہ تورات میرا معجزہ نہیں ہے۔ میرا معجزہ تورات کے علاوہ ہے۔

یہ بات پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مختص ہے کہ آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب ہی معجزہ ہے پھر بھی اس کے یہ معنی نہیں کہ آپؐ کا کوئی اور معجزہ نہ تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ آپؐ کی کتاب معجزہ ہے اور یہ آخری اور ابدی دین کا لازمہ ہے۔

دین خاتم سے متعلق دوسرا نکتہ جو خاتمیت کا ایک اور فلسفہ بھی شمار ہوتا ہے یہ ہے کہ خاتمیت کے دور کو سابقہ ادوار سے وہی نسبت حاصل ہے جو مہارت

کے دور کو ابتدائی ادوار سے ہے۔ یعنی خاتمیت کا دور انسان کے صائب الرائے ہونے کا دور ہے۔

ابتدائی مدرسہ اور ہائی سکول میں طالب علموں کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ اسے یاد کر لیتے ہیں لیکن جب وہ یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہیں اور مہارت اور تعلیم خصوصی کے مراحل کو طے کرنے لگتے ہیں تو یہ صائب الرائے ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ یہی متعلقہ فن میں درجہ اجتہاد کہلاتا ہے۔

اسی طرح دین خاتم کا دور کسی خاص فرد کے دوسرے فرد سے مقابلہ کرنے کے طور پر نہیں بلکہ مجموعی طور پر انسان کے صائب الرائے ہونے کا دور ہے۔

انسان کے صائب الرائے ہونے کے دور ہی میں دینی مسائل میں اجتہاد اور پھر مجتہد کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سابقہ ادوار میں مجتہد ہوتے تھے؟ کیا حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے ادیان میں کوئی مجتہد وجود رکھتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ قرآن کریم نے جس چیز کو فقاہت اور تفقہ سے تعبیر کیا ہے وہ ان ادیان میں کسی صورت میں بھی نظر نہیں آتی۔

جو کام آج کا مجتہد علم' استدلال اور اجتہاد کے ذریعے انجام دیتا ہے وہی کام سابقہ انبیائے کرامؑ انجام دیتے تھے لیکن اجتہاد کے ذریعے نہیں بلکہ وحی و نبوت کی مدد سے۔ سابقہ ادیان میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں تھی کیونکہ خود دین ہی میں اجتہاد کی گنجائش ہونی لازم ہے۔ یعنی خود دین میں قواعد کلیہ اور اصول بیان ہونے کی گنجائش ہونی چاہیے تاکہ ماہرین ان اصول و قواعد کے تحت غور و فکر کر کے جزوی مسائل حل کر سکیں۔ سابقہ ادیان چونکہ ابتدائی تعلیم کے مترادف تھے اس لیے وہ اصول و قواعد کو بیان نہیں کرتے تھے کیونکہ انسان میں ان کے سیکھنے کی استعداد ہی نہیں پائی جاتی تھی۔

دین میں مرسل و غیر مرسل انبیا کی اصطلاح رائج ہے۔ مرسل انبیا سے مراد وہ پیغمبر ہیں جو صاحب شریعت و قانون ہیں مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ۔ غیر مرسل انبیا سے مراد وہ پیغمبر ہیں جو دوسرے پیغمبروں کے تابع اور ان کی شریعت کی تبلیغ کرنے والے ہیں جن کا اپنا کوئی قانون نہیں ہے۔ یعنی جو کام

آج کل مجتہدین انجام دیتے ہیں وہی کام ہے جو غیر مرسل انبیا انجام دیتے تھے۔ لیکن مجتہد کا کام اس میں منحصر نہیں۔ وہ مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کا حاکم شرعی اور رہبر بھی ہوتا ہے' معروف کا امر دینے والا اور منکر سے روکنے والا بھی ہے' وہ امت کا مصلح بھی ہے اور برائیوں کی اصلاح کرنے کا بھی پابند ہے۔ اسی کام کو سابقہ ادوار میں پیغمبرؐ انجام دیا کرتے تھے لیکن دین خاتم میں چونکہ ان مقاصد کے لیے کوئی اور نبی مبعوث نہیں ہوتا اس لیے مجتہدین ہی ان فرائض کو انجام دیتے ہیں۔ پیغمبر کرامؐ کی اس حدیث کے یہی معنی ہیں جو آپؐ نے فرمائی کہ **"علماامتی کانبیانبی اسرائیل"** یعنی میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیا کی مانند ہیں۔ اس سے مراد بنی اسرائیل کے صرف وہ انبیا ہیں جن کا کام حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی ترویج' تفہیم' تعلیم اور تبلیغ کرنا تھا۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ سابقہ انبیا کا دور وحی کا دور ہے یعنی اس دور میں تبلیغ و ترویج دین بھی خود انبیائے کرامؑ ہی کرتے تھے۔ جبکہ دین خاتم کے زمانہ میں بعض کام یعنی تبلیغ و ترویج سے متعلق اور کلیات سے جزئیات کو استنباط کرنے کے کام کو علما انجام دیتے ہیں انبیاءؑ نہیں۔ پس علما اس اعتبار سے اور انہی حدود کے اندر پیغمبروں کے جانشین ہیں۔ لیکن سب پیغمبروں کے نہیں بلکہ صرف ان پیغمبروں کے جو صاحب شریعت نہیں ہیں۔

اعجاز قرآن کی وجوہ

مجموعی طور پر قرآن کریم کا اعجاز دو اعتبار سے ہے۔ لفظی اور معنوی۔ لفظی اعجاز اس کی ہنر و زیبائی کے اعتبار سے اور معنوی علمی و فکری اعتبار سے۔ ہنر و زیبائی کی دنیا علم و فکر کی دنیا سے جدا ہے۔ اسی طرح زیبائی کا تعلق فن سے ہے اور علم کا تعلق کشف سے۔ علم وہ چیز ہے جو کسی حقیقت کو انسان پر منکشف کرتا ہے۔ جبکہ جمال و زیبائی سے مراد وہ چیز ہے جو کسی حسین و جمیل شے کو وجود میں لاتی ہے۔

لیکن ہنر و زیبائی کے اپنے اپنے مختلف موضوعات و مقولات ہیں۔ ان میں

سے ایک "سخن" ہے۔ اتفاق سے انسان تمام زیبائیوں میں زیبا سخن اور فصیح گفتگو کے سامنے جس قدر اپنی حیرت و پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے شاید کسی دوسری زیباشے کے سامنے نہیں کرتا۔

ہم زیبائی کو دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ا۔ حسی زیبائی اور ۲۔ ذہنی زیبائی۔ حسی زیبائی پھر دو قسموں سمعی و بصری میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ گل و گلشن کی زیبائی محسوس کی جا سکنے والی بصری زیبائی ہے اور ایک اچھی آواز کی زیبائی محسوس کی جا سکنے والی سمعی زیبائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا زیبائی سخن بھی انہی اقسام سے ہے؟ ہرگز نہیں' بلکہ در حقیقت زیبائی سخن حسی نہیں بلکہ فکری ہے۔

ایک خوبصورت شعر یا ایک خوبصورت نثر انسان کو کس حد تک اپنی جانب جذب کرتے ہیں مثلاً شیخ سعدی کہتے ہیں:

"منت خدای را عزوجل کہ طاعتش موجب قربت است و بہ شکر اندرش مزید نعمت هر نفسی کہ فرو میرود ممد حیات است وچون کہ بر آید مفرح ذات۔ پس در هر نفسی دو نعمت موجود و بر هر نعمتی شکری واجب"

(ترجمہ: یعنی خدائے عزوجل کا احسان جس کی وجہ سے اطاعت خدا اس کی قربت کا باعث بنتی ہے اور جس کے لیے اس کا شکر زیادہ سے زیادہ واجب ہے سانس لینا نعمت ہے کیونکہ ہر سانس جو اندر جاتی ہے زندگی کی معاون ہوتی ہے اور جب باہر آتی ہے تو مفرح ذات۔ لہٰذا ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں اور ہر نعمت کا شکر واجب ہے۔)

اس کے فوراً بعد یہ شعر کہتے ہیں۔

از دست و زبان کہ بر آید
کز عہدہ شکرش بدر آید

اس کے فوراً بعد قرآن مجید کی اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

"اعملوا آل داود شکرا و قلیل من عبادی الشکور" (سبا / ۱۳)

پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

فراش باد صبا را گفته تا فرش زمردین بگستراند و دایہ ابر بہاری فرمودہ تا نبات در مہد زمین بپروراند.....

(ترجمہ: یعنی فرش بچھانے والے نے بادصبا سے کہا کہ سبز رنگ کا فرش بچھا دے اور ابر بہاری کو حکم دیا کہ زمین پر سرخ پھول پیدا کرے۔)

یہ جملے شعر اور نثر اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ خوبصورتی کے ساتھ چپے گئے ہیں کہ سعدی کی رحلت کو تو سات سو سال گزر چکے ہیں۔ لیکن ان کی گلستان ابھی تک خود کو محفوظ کئے ہوئے ہے؟

ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ یہ زیبا ہے' فصیح و بلیغ ہے۔

قاآنی مشہور شعرا میں سے ہے۔ شیخ سعدی کا ہم وطن بھی ہے شیراز کا رہنے والا ہے اس نے ہمیشہ شیخ سعدی کی رقابت کرنا چاہی۔ اس نے گلستان کی طرز پر ایک کتاب بھی تحریر کی لیکن سعدی کے مرتبہ کو نہ پا سکا۔

کہتے ہیں کہ موسم سرما کی ایک رات کو کچھ لوگ آگ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے گویا یہ ایک ادبی نشست تھی۔ اس محفل میں ایک قوال بھی تھا اس نے شیخ سعدی کی یہ مشہور غزل گانا شروع کی۔

"شبی خوش است و در آغوش شاھد شکرم....."

جب وہ اس شعر پر پہنچا۔

ببند یک نفس ای آسمان دریچہ صبح

(یعنی اے آسمان تھوڑی دیر کے لیے صبح کی کھڑکی کو آفتاب کے لیے بند کر دے کہ میں آج کی شاب قربی سے خوش ہوں۔)

قاآنی جو خود بہت بڑا شعر شناس تھا اس قدر متاثر ہوا کہ کہنے لگا کہ سعدی نے کسی اور شعر کی ضرورت ہی نہیں رہنے دی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا دیوان آگ میں پھینک کر جلا ڈالا اور کہا اگر شعر یہی ہے تو پھر ہم لوگ اشعار نہیں کہتے۔

بعض اوقات کوئی شعر اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ قاآنی جیسا شاعر جو خود استاد سخن ہے قوال کی زبانی اس کو سنتا ہے تو اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے کہ شعر کس قدر بلند مرتبہ ہے جس کے مقابلہ

میں اس کا اپنا مقام کس قدر پست ہے۔ اس کو کلام کا اثر کہتے ہیں۔

حافظ شیرازی کس چیز سے زندہ ہے؟ مولانا روم کو کس چیز نے ابھی تک باقی رکھا ہوا ہے؟ صرف ان کے اشعار کی زیبائی نے۔ کیونکہ کلام کی زیبائی یا علماء کی اصطلاح میں فصاحت' بلاغت کی روشنی' خلاقیت کی رسائی' کشش اور جاذبیت' ناقابل انکار اقدار ہیں۔

اسی طرح ہر سخن شناس اور قرآن کی زبان کو کسی قدر سمجھنے والا شخص' حتیٰ کہ عربی زبان سے آگاہ فرنگیوں نے بھی تصدیق کی ہے کہ قرآن کریم فصاحت و بلاغت اور کلام کی زیبائی کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔

قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے۔ یہ نہ نثر ہے نہ ہی شعر' جبکہ ہر کلام یا تو نثر میں ہوتا ہے یا شعر میں۔ قرآن کے اشعار پر مشتمل نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں وزن و قافیہ جو شعر کے اصلی ارکان شمار ہوتے ہیں' نہ ہونے کے علاوہ شعر کے دوسرے ارکان یعنی تخیل وغیرہ کو بھی اس کے لیے کلام میں نہیں لایا گیا' یعنی کسی تخیل کی پابندی کے بغیر تمام مضامین بیان کر دیئے گئے ہیں۔

تخیل سے مراد مبالغہ آمیز تشبیہات و تراکیب ہیں جو اشعار میں استعمال کی جاتی ہیں' جن کے متعلق کہا گیا ہے: **"احسن الشعراء اکذبہ"** یعنی بہترین اشعار وہ ہیں جن میں زیادہ تر جھوٹ کی آمیزش ہو۔ کیونکہ اشعار میں جھوٹ جس قدر زیادہ ہو گا اسی قدر وہ زیادہ خوبصورت معلوم ہوں گے۔ مثلاً فردوسی کا یہ شعر ہے۔

زسم ستوران در آن پہن دشت
زمین شد شش و آسمان گشت ہشت

(یعنی اس وسیع و عریض میدان میں گھوڑوں کے سموں کی اتنی دھول اٹھی کہ زمینیں چھ اور آسمان آٹھ ہو گئے۔)

جو کوئی یہ شعر سنتا ہے واہ واہ کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن اس میں کتنا بڑا جھوٹ بتایا گیا ہے! اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گا کہ کسی بہت ہی تنگ مقام پر گھوڑوں کے دوڑنے اور گرد و خاک اڑانے سے آسمان کے سات طبقوں کی تعداد بڑھ کر آٹھ ہو جائے اور زمین کے سات طبقات گھٹ کر چھ رہ جائیں۔ یہ بہت بڑا

جھوٹ ہے۔ لیکن جھوٹ ہی کی وجہ سے شعر حسین ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے۔

یا رب چہ چشمہ ایست محبت کہ من از آن
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم
طوفان نوح زندہ شد از آب چشم من
با آنکہ در غمت بہ مدارا گریستم

(یعنی بار الہا محبت کا چشمہ بھی کیسا عجیب ہے کہ میں نے اس کا صرف ایک قطرہ پی لیا تو آنسوؤں کا دریا بہا دیا۔ یہ دریائے اشک اتنا شدید تھا کہ تیرے غم میں محبت کے جو اشک میں نے بہائے ان سے طوفان نوح کی یاد تازہ ہو گئی۔)

یہ اشعار بھی بہت دلکش اور شیریں ہیں۔ لیکن اتنے ہی بڑے جھوٹ پر مبنی ہیں۔ اسی لیے یہ دلکش بھی زیادہ ہیں۔ ایسے اشعار کو مروجہ جھوٹ قرار نہیں دے سکتے۔ شرعی طور پر بھی یہ جھوٹ نہیں ہیں بلکہ یہ فن اور کلام کو خوبصورت بنانے کی ایک طرح ہے۔ لیکن قرآن کریم نے بنیادی طور پر ایسی باتوں سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں رکھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کلام کی اس طرح کی زیبائیاں صرف خاص موضوعات مثلاً عشق' رزم' مدح اور ہجو وغیرہ میں پیش کی جاتی ہیں۔ کوئی شاعر معنویات میں اپنے فن کا مظاہرہ کر سکا ہے نہ کر سکتا ہے۔ معنویات میں اگر داخل ہونا بھی چاہے تو چونکہ وہاں اپنے فن کا مظاہرہ نہیں کر سکتا بلکہ معنی کو مادہ کا لباس پہنائے گا اور کنایہ کی زبان میں معنی کو بیان کرے گا۔ مثلاً شعرا معرفت کو بیان کرنا چاہتے ہوں تو اسے "مے" کا لباس پہناتے ہیں یا حق تعالی کے جلال کی بات کرنا چاہتے ہوں تو اسے "زلف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنی ہستی کو اس کی راہ پر قربان کر دینے اور فنا فی اللہ کے مقام کو پا لینے کو ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں کہ۔

"خرقہ جائی گرو بادہ و دفتر جائی"

وغیرہ وغیرہ۔

لیکن قرآن کریم معنوی مسائل کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کو شفاف پانی

کی روانی کی طرح بیان فرماتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے۔

"بسم الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین۔ ایاک نعبد ایاک نستعین۔"

ہر مسلمان مدت العمر ان جملوں کو ہر روز نماز میں کم از کم دس مرتبہ دہراتا ہے۔ لیکن ان میں اتنی مٹھاس اور جاذبیت ہے کہ نہ وہ کبھی تھکتا ہے اور نہ ہی اس سے سیر ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کریم اشعار کی کتاب نہیں کیونکہ اس میں وزن و قافیہ کا بالکل دخل نہیں نیز مضامین کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے صرف تخیل سے کام نہیں لیا گیا۔ اسی طرح قرآن کریم خالصۃً "نثر بھی نہیں کیونکہ کسی نثر میں لے نہیں ہوتی جبکہ قرآن میں ایک انوکھی طرز موجود ہے۔

کیا آپ نے کوئی ایسی دینی یا دنیوی کتاب دیکھی ہے جس کو مختلف صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہو؟ ایسی واحد کتاب جس کو خاص طرز کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے قرآن کریم ہی ہے اور یہ بات اب ایک علم کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ قرآن مجید کی مختلف آیات کو الگ الگ طرز میں پڑھا جا سکتا ہے یعنی مختلف طرزیں آیات کے معانی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔ مثلاً ڈرانے والی آیات کو ایسی طرز پر پڑھا جاتا ہے جس سے دل دہل جائے اور خوفزدہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جن آیات میں شوق دلایا گیا ہے وہ ایسی طرز سے پڑھی جاتی ہیں جس سے سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

آپ عیسائیوں کے وسیع و عریض ممالک کا دورہ کریں یا یہودیوں کی دنیا میں چلے جائیں ہرچند ان کا ملک صرف اسرائیل ہی ہے لیکن جو ریڈیو اسٹیشن اور دیگر ذرائع ابلاغ ان کے تسلط میں ہیں ان کا جائزہ لیں تو کیا آپ ان کو ریڈیو پر توریت و انجیل کی تلاوت کرتے ہوئے پائیں گے؟ اگر وہ ان کی تلاوت کریں تو یہ تلاوت تمسخر آمیز ہو گی اور کسی میں اس کے سننے کا حوصلہ نہ ہو گا۔ اسی طرح کیا شیخ سعدی کی نثر کو خاص طرز کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے؟

یہ قرآن کریم کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے جو نہ اس سے پہلے

موجود تھی اور نہ ہی عربی زبان میں اس کے بعد کہیں نظر آتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سب لوگ جنہوں نے قرآن کریم حفظ کیا' قرآن کے عاشق رہے اور خود بھی اپنے زمانہ کے بلند پایہ ادیب تھے' ایسی دو سطریں بھی نہ کہہ سکے جو قرآن حکیم سے ملتی جلتی ہوں۔

دنیا امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی فصاحت و بلاغت کی معترف ہے۔ میں نے اپنی کتاب "سیری در نہج البلاغہ" میں جن موضوعات پر بحث کی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ امیر المومنینؑ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تیرہ سو پچاس سال ہو گئے اور ہر زمانہ میں مختلف ذوق رکھنے والے عربی زبان کے اول درجے کے فصحا' ادبا' مصنفین اور خطبا گزرے ہیں' لیکن اس کے باوجود امیر المومنینؑ کے کلام کی عظمت ہر لحاظ سے برقرار ہے۔

امیر المومنینؑ نے قرآن کی پہلی آیت یعنی **اقراء باسم ربک الذی خلق** (علق /۱) (اس اللہ کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا) کو دس یا گیارہ برس کی عمر میں اس وقت سنا جب دوسرے افکار نے آپ کے ذہن پر کوئی پختہ نقش پیدا نہیں کیا تھا۔ آپؑ صرف فراواں استعداد سے بہرہ مند تھے۔ قرآن کے ساتھ آپؑ صرف مانوس تھے۔ اگر کوئی شخص قرآن کے مثل کلام کہہ سکتا ہوتا تو اس کے لیے آپؑ ہی سب سے زیادہ سزاوار تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب ہم نہج البلاغہ کو قرآن کریم کے پہلو میں رکھتے ہیں تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف اسلوب کلام ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے آخری دور میں جب میں قرآن کریم سے آشنا ہو چکا تھا اور نہج البلاغہ سے بھی تو ونیا" یہ نکتہ مجھ پر کھلا۔

میں نے نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا۔ اس میں ایک خطبہ ایسا ہے جس میں بہت زیادہ تشبیہات و تمثیلات استعمال کی گئی ہیں اور واقعی جس طرح کی فصاحت و بلاغت انسان سے ممکن ہے یہ اس سے کہیں زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ یہ خطبہ شروع سے آخر تک موعظہ ہے' موت اور عالم آخرت کی یاد دہانی ہے' واقعی دل ہلا دینے والا خطبہ ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

"دار بالبلاء محفوفة و بالغدر معروفة لا تدوم احوالها ولا تسلم نزالها احوال مختلفة و تارات متصرفة العيش فيها مذموم و الامان منها معدوم و انما اهلها فيها اغراض مستهدفة ترميهم بسهامها..... "۱۸

ترجمہ: "(یہ دنیا) ایسا گھر ہے جو بلاؤں میں گھرا ہوا اور فریب کاریوں میں شہرت یافتہ ہے۔ اس کے حالات کبھی یکساں نہیں رہتے' نہ ہی اس میں رہنے والے صحیح و سالم رہ سکتے ہیں۔ اس کے حالات مختلف اور اطوار تغیر پذیر ہیں۔ خوش گزرانی کی صورت اس میں قابل مذمت اور امن و سلامتی کا اس میں پتہ نہیں۔ اس کے رہنے والے تیر اندازی کے ایسے نشانے ہیں جن پر دنیا اپنے تیر برساتی رہتی ہے۔"

پھر آپ فوراً قرآن مجید کی آیت تلاوت فرماتے ہیں۔

"هنا لک تبلوا کل نفس ما اسلفت و ردوا الی اللہ مولا هم الحق و ضل منهم ما کانوا یفترون۔" (یونس / ۳۰)

(یعنی اس وقت ہر شخص اپنے سابقہ اعمال کا امتحان کرے گا سب مولائے برحق خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں پلٹا دیئے جائیں گے اور جو کچھ افترا کر رہے تھے سب بھٹک کر گم ہو جائے گا۔)

امیرالمومنینؑ کا کلام بہت بلند پایہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب مذکورہ آیت اس کے وسط میں آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا سابقہ کلام پر پانی ڈال دیا گیا ہو یا تاریکی میں ایک ستارہ نمودار ہو گیا ہو۔ آیت کا اسلوب ایک الگ اسلوب ہے۔ انسان جو محسوس کرتا ہے اسے اس طرح بیان کر ہی نہیں سکتا۔ مذکورہ آیت میں قیامت کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کس طرح ان باطل خداؤں کے مقابلہ میں اپنے خدائے برحق کی طرف لوٹایا جائے گا۔

قرآن کا زمانہ فصاحت و بلاغت کا زمانہ تھا یعنی اس زمانہ میں لوگوں کا فن صرف فصاحت و بلاغت تھا۔

سب جانتے ہیں کہ عربوں کا بازار عکاظ کے نام سے لگا کرتا تھا' حرمت

والے مہینوں میں جنگ پر پابندی ہوتی تھی اور اس بازار میں شعری شاہکار پیش کیے جاتے تھے۔ مختلف قبائل کے شعرا یہاں آکر اپنا اپنا کلام سناتے اور اس بازار میں منتخب ہونے والے اشعار کو خانہ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا جاتا۔ سات قصیدے جو "معلقات سبع" کے نام سے مشہور ہیں ان قصائد سے تھے عربوں کی نظر میں جن سے بڑھ کر اور اشعار نہیں تھے۔ یہ مدتوں وہاں آویزاں رہے قرآن کریم کے نزول کے بعد وہ لوگ خود ہی ان کو وہاں سے ہٹالے گئے۔

لبید ابن زیاد عرب کا صف اول کا شاعر ہے۔ نزول قرآن کے بعد جب مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنا چھوڑ دیا اور ہمیشہ قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہتا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اب مسلمان ہو کر عالم اسلام میں اپنے فن سے استفادہ کرتے ہوئے شعر کیوں نہیں کہتا؟

اس نے کہا اب میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر کلام قرآن ہی ہے تو پھر ہماری ساری باتیں ہجو ہیں اور میں قرآن کریم سے وہ لذت پاتا ہوں جس سے بہتر اور لذت ہے ہی نہیں۔

زیر بحث آیت میں قرآن کریم نے دعوت مقابلہ دی ہے کہ جو کوئی قرآن کریم کی مانند ایک سورہ لا سکتا ہو لے آئے۔ لیکن ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ **"فلیاتوا بحدیث مثلہ"** (طور / ۳۴) (پس یہ بھی ایسا ہی کوئی کلام لے آئیں) جس میں ایک آیت بھی شامل ہو سکتی ہو۔ یعنی قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر لا سکتے ہو تو قرآن کریم کی مانند ایک جملہ ہی بنا لاؤ۔

نزول قرآن کے دوران اور اس کے بعد بھی قرآن کریم کے کتنے دشمن تھے لیکن قرآن حکیم کی اس دعوت مقابلہ کا جواب نہ دے سکے، حتیٰ کہ ہمارے زمانہ میں بھی قرآن کے مقابلہ میں بعض چیزیں گھڑی گئیں لیکن جب قرآن کے ساتھ ان کا موازنہ کیا تو دیکھا کہ قرآن سے ان کی کوئی شباہت نہیں ہے۔

پس قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ایک پہلو اس کا فنی پہلو ہے جس کو اصطلاح میں فصاحت و بلاغت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ تعبیر کافی نہیں۔ کیونکہ فصاحت معنی روشنی کے اور بلاغت کے معنی رسائی کے ہیں۔ ان میں جاذبیت کا بھی

اضافہ ہونا چاہیے جو قرآن کریم کی دلکشی کی نشاندہی کرے کیونکہ قرآن کریم ایک خاص طریقہ سے قلوب پر اثر انداز ہوتا' اپنی مخصوص دلکشی کی بنا پر تیزی سے اثر کرتا اور قلوب کو مسخر کر لیتا ہے۔

یہ جو کفار آنحضرتؐ کو جادو گر کہتے تھے' یہ بجائے خود ایک طرح کا اعتراف تھا کہ اس کی نظیر لانا ہمارے بس میں نہیں اور یہ قرآن کریم کی کشش اور دلکشی کی بنا پر ہی تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ غیر معتقد شخص ایک دوبار قرآن کریم کو سننے کے بعد اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے تو کہتے کہ یہ جادو ہے۔

مکہ میں جو اجنبی آتے تھے عموماً مسجد الحرام کے طواف کو جاتے تھے مشرکین ان کو تاکید کرتے کہ کانوں میں اچھی طرح روئی ٹھونس کر جائیں تاکہ جس شخص کے کلام میں جادو ہے ہمیں خوف ہے کہ وہ کہیں تم پر جادو نہ کر دے اس کی آواز تمہارے کانوں تک نہ پہنچے۔ اس غرض سے وہ انہیں روئی بہم پہنچاتے۔

اتفاق سے مدینہ کا ایک سردار مکہ آیا۔ مکے والوں میں سے ایک شخص نے اس کو یہی تاکید کی۔ وہ سردار خود بیان کرتا ہے کہ میں نے اپنے کان روئی سے اس طرح بند کر لیے تھے کہ اگر میرے کانوں کے پاس ڈھول بھی بجایا جاتا تو اس کو بھی نہ سن پاتا۔ میں مسجد الحرام آیا اور طواف شروع کیا۔ میں نے وہاں ایک شخص کو عبادت میں مشغول پایا جس کی شکل نے مجھے اپنی جانب جذب کیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں لیکن اس کی آواز کو سن نہیں رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ کیا بات تھی جو انہوں نے مجھ سے کہی! میں ان کی بات کیوں قبول کروں۔ بہتر ہے کہ میں روئی کانوں سے نکال دوں اور سنوں کہ یہ شخص کہتا کیا ہے! اگر اس کی بات معقول ہوئی تو تسلیم کر لوں گا ورنہ تسلیم نہیں کروں گا۔ میں روئی نکال کر اس شخص کے پاس گیا اور اس کی باتوں کو توجہ سے سنا۔ وہ آہستہ آہستہ قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔ میں سنتا رہا۔ اس سے میرا دل اتنا نرم ہو گیا کہ مجھے خود اپنی خبر نہ رہی اور میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔

یہ شخص تاریخ اسلام میں ایک ثابت قدم مومن ثابت ہوا اور ان افراد

میں سے ایک ہے جنھوں نے آنحضرتؐ کی ہجرت مدینہ کی راہ ہموار کی۔ در حقیقت یہی ملاقات مدینہ میں اسلام کے پھیلنے اور نبی اکرمؐ کی ہجرت مدینہ کی باعث بنی۔ ۱۹ ۔

یہ قرآن کریم اسی دلکشی، فن اور حسن کا نتیجہ ہے۔ ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا اسلامی ادب پر قرآن کے معنوی اثرات میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صدر اسلام یعنی ہجرت کے اولین ایک دو سالوں میں عربی ادب موجود تو تھا لیکن قرآن کریم کو جو مقام حاصل ہونا چاہیے تھا حاصل نہیں تھا۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے ادب پر قرآن کریم کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

فارسی کے مسلمان شعرا کی طرف آئیں۔ اودکی تیسری صدی ہجری کا شاعر ہے۔ اس کے اشعار خالص فارسی زبان میں ہیں یعنی ان میں قرآن مجید کا اثر اتنا زیادہ دکھائی نہیں دیتا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہوئے فردوسی اور اس کے بعد والے زمانہ تک پہنچتے ہیں تو قرآن کا نفوذ زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ جب ہم چھٹی اور ساتویں صدی ہجری یعنی مولانا رومؒ کے زمانہ تک پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مولانا روم قرآن کے سوا کوئی بات کرتے ہی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں سب قرآن کی تفسیری ہے، البتہ عرفانی نقطہ نگاہ سے، جبکہ قاعدتاً معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے یعنی ادبی تخلیق کا اثر اپنے زمانہ میں بعد کی ایک دو صدیوں کی نسبت زیادہ ہونا چاہیے۔

یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت سے متعلق ایک مختصر سی بحث تھی جبکہ قرآن کے اعجاز کا دوسرا پہلا معنوی ہے۔

اگر ہم قرآن کریم میں مذکور الہیات کے مباحث پر غور کریں، معاد اور سابقہ انبیا کرامؑ کے بارے میں قرآن کی منطق کا جائزہ لیں یا فلسفہ تاریخ اور فلسفہ اخلاق سے متعلق قرآنی منطق کا مطالعہ کریں تو ہمیں قرآن کریم کی عظمت کا پتہ چلے گا۔

یہی وہ مسائل ہیں جن کو سمجھانے کے لیے قرآن مجید کا نزول ہوا ہے۔

کیونکہ ظاہر ہے قرآن طب کی کتاب تو نہیں ہے نہ ہی یہ انجینئرنگ کی کتاب ہے بلکہ ایسی کتاب ہے جس کا کام لوگوں کی ہدایت کرنا ہے۔

قرآن کریم کے اعجاز کے اور بھی پہلو ہیں مثلاً غیب کی خبریں یا غیبی پیشین گوئیاں سارے قرآن کا ہم آہنگ ہونا اور اس میں اختلاف کا نہ پایا جانا۔ ان میں سے ہر ایک موضوع پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر عمر باقی رہی تو آئندہ تقریروں میں ان کے بارے میں بحث کروں گا۔ ۲۰

-----○☆ اختتام ☆○-----

maablib.org

حواشی

۱۔ مذکورہ بالا مسئلہ میں اہل تشیع کے درمیان اتفاق رائے پایا جاتا ہے جبکہ اہل تسنن کے مابین اس نظریہ میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا نظریہ وہی ہے جو اہل تشیع کا ہے، بعض اہل تشیع کی رائے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں جبکہ بعض تفصیل کے قائل ہیں۔
ابن عباس، ابن مبارک، عاصم، کسائیؒ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ، ابو ہریرہؓ، عطاء، طاوس، نیز امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں اور جلال الدین سیوطی اتقان میں، جو کہ تواتر روایات کے مدعی ہیں، ان افراد میں سے ہیں جو معتقد ہیں کہ بسم اللہ قرآن کا جزو ہے۔
مالک، ابو عمرو اور یعقوب جیسے بعض افراد کا کہنا ہے کہ یہ کسی بھی سورہ کا جزو نہیں ہے بلکہ سورہ ہائے قرآن کے آغاز میں فقط تبرکاً نازل ہوتی رہی ہے۔ نیز یہ مختلف سورتوں کو علیحدہ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔
مسلک شافعی و حمزہ کے بعض پیروکار تفصیل کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فقط سورہ حمد میں بسم اللہ سورۃ کا حصہ ہے، دوسری سورتوں کا حصہ نہیں۔
بعض حضرات نے احمد بن حنبل کی طرف پہلے قول کو منسوب کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۶) جبکہ بعض افراد نے تفصیل والے قول کو تسلیم کیا ہے۔ (تفسیر آلوسی ج ۱ ص ۳۹)
جہاں تک اہل سنت کے فقہا کی نظر میں اسے نماز میں پڑھنے کا تعلق ہے مندرجہ ذیل تفصیلات کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۔ حنفی کہتے ہیں کہ امام اور فرادی نماز پڑھنے والا بسم اللہ کو آہستہ پڑھے۔ ۲۔ مالکی کہتے ہیں کہ واجب نماز میں بسم اللہ کو پڑھنا مکروہ ہے۔ ۳۔ شافعی کہتے ہیں کہ بسم اللہ سورہ حمد کی آیت ہے۔ لہٰذا اسے پڑھنا واجب ہے۔ ۴۔ حنبلی کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھنا سنت ہے اور یہ سورۂ حمد کی آیت نہیں ہے۔ (ہم نے مذکورہ مطالب کو الفقہ علی المذاہب الاربعہ سے تلخیص کے ساتھ نقل کیا ہے۔) اس کے برعکس اہل بیتؑ سے منقول روایات اور سیرت مسلمین کی بنیاد پر تمام شیعہ فقہا کا فتویٰ ہے کہ بسم اللہ قرآن مجید کا حصہ ہے اور نماز میں اس کا پڑھنا واجب ہے ان روایات کے حوالہ جات کے لیے درج ذیل کتب کی جانب رجوع کریں۔

فروع کافی' باب قرآئۃ القرآن ص۸۶' استبصار باب الجہر بابسم اللہ ج ۱ ص ۳۱۱' تہذیب باب الصلاۃ و منشا ص ۱۵۲' وسائل الشیعہ باب کیفیت الصلاۃ و منشا ص ۱۵۲' وسائل الشیعہ باب ان البسم اللہ آیت من الفاتحہ ج ۱ ص ۳۵۲۔

۲۔ مثنوی مطبوعہ کلالہ خاور' ص ۳۲ بیت ۲۷۔

۳۔ اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

۴۔ روایات میں رحمٰن و رحیم میں پایا جانے والا فرق ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ **عن الصادقؑ (فی حدیث) و اللّٰہ الہ کل شیء۔ الرحمٰن لجمیع خلقہ الرحیم بالمومنین خاصۃ** (کافی۔ توحید صدوق۔ تفسیر عیاشی) "یعنی اللہ ہر شے کا معبود ہے' وہ پورے عالم تخلیق کے لیے رحمٰن اور مخصوص مومنین کے لیے رحیم ہے۔" اس حدیث میں رحمٰن پروردگار عالم کی اس رحمت کا پتہ دیتا ہے جو تمام مخلوق کے لیے ہے جبکہ رحیم صرف مومنین سے مخصوص رحمت کا پتہ دیتا ہے۔

۵۔ نہج البلاغہ میں عبادت کرنے والوں کو عبادت کے اعتبار سے تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں **ان قوما عبدوا اللّٰہ رغبۃ فتلک عبادۃ التجار و ان قوما عبدو اللّٰہ رھبۃ فتلک عبادۃ العبید و ان قوما عبدوا اللّٰہ شکرا فتلک عبادۃ الاحرار۔**"

ایک جماعت نے اللہ تعالیٰ کی عبادت ثواب کی رغبت و خواہش کے پیش نظر کی یہ تاجروں کی عبادت ہے' ایک اور جماعت نے خوف کی وجہ سے اس کی عبادت کی

یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور جماعت از روئے شکر و سپاس گزاری اس کی عبادت کرتی ہے یہ آزاد بندوں کی عبادت ہے۔

۶۔ بوستان سعدی۔

۷۔ تفسیر المیزان ج ۲۰، ص ۲۲۹۔

۸۔ مزید وضاحت و تفصیل سے مطلع ہونے کے لیے استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی کتاب "عدل الٰہی" کی جانب رجوع کریں۔ (ناشر)

9۔ و یقال طریق معبد ای مذلل بالتوطی۔ (مفردات راغب)۔

۱۰۔ عربی میں "بقرۃ" گائے کو کہتے ہیں۔ مترجم۔

۱۱۔ "فسق" کا لفظ فسقت الثمرۃ سے نکلا ہے۔ جب کھجور کو دبایا جاتا ہے تو اس کی گٹھلی باہر نکل آتی ہے۔ اس وقت کہا جاتا ہے۔ "فسقت الثمرۃ" یعنی کھجور پھٹ گئی اور اس کی گٹھلی باہر نکل آئی۔

۱۲۔ نہج الفصاحت اور جامع صغیر، ج ۱، ص ۱۰۲۔

۱۳۔ لفظ "رب" کی تفسیر میں اس سلسلے میں تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

۱۴۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۵، ترجمہ مفتی جعفر حسین"

۱۵۔ کتاب "عدل الٰہی" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ یہ خیال باطل ہے کہ اگر ہمارے کام سبب و مسبب کے طریقہ پر ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم عاجز ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ قادر مطلق ہے اس لیے اس کے کاموں کا سبب و مسبب کے طریقہ پر ہونا لازم نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حکما کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال و قدوسیت متقضی ہیں کہ سب کام علت و معلول کے نظام کے تحت انجام پائیں۔ بالفاظ دیگر علت و معلول کا نظام فعل خدا کے نظام کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اسباب کے ذریعے اپنے احکام کو عملی جامہ پہناتا ہے، وہ اسباب طبیعی ہوں مثلاً بارش کا برسنا اور نباتات کا اگانا یا ان اسباب کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہو، مثلاً ملائکہ اور حق تعالیٰ کے نظر نہ آنے والے لشکر۔

۱۶۔ اصول فلسفہ و روش اصولیت کی جلد سوم کے حاشیہ کی جانب قارئین کرام رجوع فرمائیں۔ وہاں اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ علت و معلول کے درمیان پایا جانے والا رابطہ کیسا رابطہ ہوتا ہے اور ایک علت سے ایک سے زیادہ معلول کیوں نہیں وجود پا سکتے' نیز ایک چیز دو علتوں کی معلول کیوں نہیں بن سکتی!

۱۷۔ استاد شہید نے وحی و نبوت نامی کتاب میں قرآن مجید سے بہت سے معجزات نقل کئے ہیں۔ اس کتاب کے ص ۸ تا ۲۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۸۔ نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۷ ترجمہ قبلہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ الشریف۔

۱۹۔ مذکورہ واقعہ اسعد بن زرارہ اور ذکوان خزرجی سے متعلق ہے۔ یہ افراد اپنے قبیلہ کی طرف سے قبیلہ اوس کے ساتھ جنگ کے سلسلے میں ایک فوجی معاہدہ کے پیش نظر مکہ آئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آنے کی دولت سے مالا مال دل لے کر مدینہ واپس لوٹے اور انہوں نے حضرت رسول اللہؐ کی ہجرت کی راہ ہموار کی۔

۲۰۔ صد افسوس کہ یہ موقع ہاتھ نہ آیا۔ انقلاب ایران میں تیزی آگئی' استاد شہید مرتضیٰ مطہری نے اپنا تمام وقت انقلاب کی کامیابی کے لیے وقف فرما دیا اور آخر کار راہ خدا میں شہید ہونے کی اپنی دیرینہ آرزو سے ہمکنار ہوئے۔

maablib.org

مطبوعات مصباح القرآن ٹرسٹ
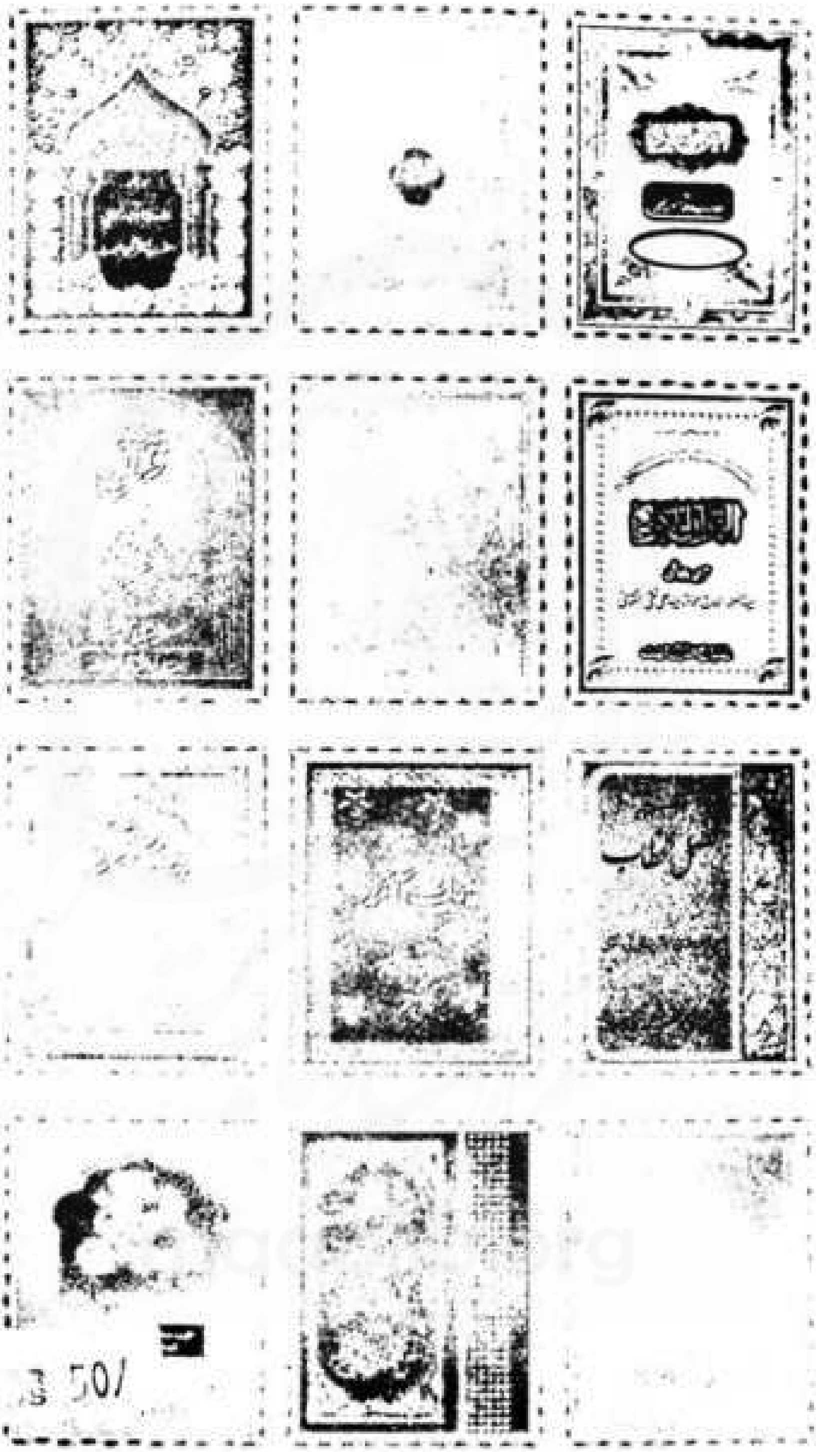
انوارالقرآن (سادہ)	ترجمہ وحواشی علامہ ذیشان حیدر جوادی	400/- روپے
انوارالقرآن (آرٹ پیپرز)	ترجمہ وحواشی علامہ ذیشان حیدر جوادی	750/- روپے
انوارالقرآن (جیبی ایڈیشن)	ترجمہ وحواشی علامہ ذیشان حیدر جوادی	850/- روپے
قرآن پاک (ایک جلدی)	ترجمہ علامہ سید علی نقی النقوی	300/- روپے
قرآن پاک (5 جلدی)	ترجمہ علامہ سید علی نقی النقوی	450/- روپے
قرآن پاک (10 جلدی)	ترجمہ علامہ سید علی نقی النقوی	500/- روپے
قرآن الحکیم	ترجمہ وحواشی مولانا بزرگ حسین نقوی	350/- روپے
قرآن پاک (سادہ)	ترجمہ وحواشی علامہ سید علی نقی النقوی	350/- روپے
قرآن پاک (آرٹ پیپر)	ترجمہ وحواشی علامہ سید علی نقی النقوی	600/- روپے
قرآن پاک (جیبی ایڈیشن)	ترجمہ وحواشی علامہ سید علی نقی النقوی	700/- روپے
قرآن الحکیم گولڈن		400/- روپے
قرآن الکریم (سادہ)	ترجمہ وحواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	300/- روپے
قرآن الکریم (آرٹ پیپرز)	ترجمہ وحواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	500/- روپے
قرآن الکریم (جیبی ایڈیشن)	ترجمہ وحواشی علامہ سید صفدر حسین نجفی	600/- روپے
قرآن پاک مترجم	از مولانا فرمان علی	
تفسیر نمونہ جدید (15 جلدیں)	علامہ سید صفدر حسین نجفی	200/- روپے فی جلد
تفسیر موضوعی (10 جلدیں)	علامہ سید صفدر حسین نجفی	150/- روپے فی جلد
تفسیر فصل الخطاب (7 جلدیں)	علامہ سید علی نقی النقوی	200/- روپے فی جلد
تفسیر پیام قرآن (6 جلدیں)	علامہ سید صفدر حسین نجفی	150/- روپے فی جلد
تفسیر میزان الحکمت (5 جلدیں)	مولانا محمدی ری شہری	300/- روپے فی جلد
ولایت فقیہ (2 جلدیں)	علامہ سید صفدر حسین نجفی	200/- روپے فی جلد
معاد (2 جلدیں)	علامہ تقی فلسفی	150/- روپے فی جلد